MUD-008

کلاسیکی اردو شاعری

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

3

اُردو مثنوی

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 9

مثنوی کی تعریف، اجزاے ترکیبی اور فنی خصوصیات 149

اکائی 10

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ) 161

اکائی 11

دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا 175

اکائی 12

شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا 187

بلاک 3 تعارف

بلاک ۳ 'اُردو مثنوی' سے متعلق ہے جس میں نو سے بارہ تک اکائیاں شامل ہیں۔

نویں اکائی بعنوان (مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات) ہے۔ اس میں مثنوی کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی کو بیان کرتے ہوئے اس کی صنفی شناخت کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی فنی خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

دسویں اکائی (مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ) کے عنوان سے ہے۔ اس میں مثنوی کے موضوعات اور اس کی مختلف اقسام سے بحث کی گئی ہے اور مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جدید دَور میں اُردو مثنوی کے موضوعات میں جو تبدیلی آئی، اس اکائی میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

گیارہویں اکائی کا عنوان (دکن میں اُردو مثنوی کا ارتقا) ہے۔ اس میں دکن میں اُردو مثنوی کے پس منظر اور بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی عہد میں اس کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں دکنی اُردو مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بارہویں اکائی بعنوان (شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا) ہے۔ اس میں شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے آغاز و ارتقا سے مفصل بحث کرتے ہوئے شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں اور نمائندہ مثنویوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات کی تفہیم کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 9 مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

9.3.1 مثنوی کی تعریف

9.3.2 مثنوی کے اجزائے ترکیبی

9.3.3 مثنوی کی فنی خصوصیات

9.3.4 ماحصل

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالوں کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف سے واقف ہوں گے۔
- مثنوی کے اجزائے ترکیبی کو سمجھیں گے۔
- مثنوی کے فن سے بحث کریں گے۔
- مثنوی کے فن کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- مثنوی کے فن کی انفرادیت اور اہمیت کو سمجھیں گے۔

9.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ اردو کے نمائندہ قصیدہ گو شعرا مرزا محمد رفیع سوداؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مرزا غالبؔ، محسنؔ کاکوروی کی قصیدہ نگاری کی فنی خصوصیات وامتیازات اور اُردو قصیدہ نگاری میں ان کے مقام ومرتبے سے واقف ہوئے۔ صنفِ قصیدہ کی طرح صنفِ مثنوی بھی کلاسیکی شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔ اب تیسرے

بلاک کی اس پہلی اکائی میں آپ صنفِ مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اور اس کے اجزاے ترکیبی سے واقف ہوں گے اور اس کی فنی خصوصیات و امتیازات اور اس کی انفرادیت کو سمجھیں گے۔

9.3 مثنوی کی تعریف، اجزاے ترکیبی اور فنی خصوصیات

9.3.1 مثنوی کی تعریف

مثنوی کا لفظ عربی کے لفظ 'مثنیٰ' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں دو دو کے یا دو کیا گیا وغیرہ۔ مشہور عربی لغت 'المعجم الوسیط' میں اس لفظ سے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے:

''المثنوی من الشعر ما کان فیہ کل شطرین بقافیۃ واحدۃ''۔

(المعجم الوسیط : مرتبین : ابراہیم مصطفیٰ، احمد حسن وغیرہم، المکتبہ الاسلامیہ، ترکی، ۱۹۷۲ء، جلد اول، ص: ۱۰۲)

یعنی وہ شعر جس کے دونوں مصرعے ایک قافیہ میں ہوں۔ 'فرہنگ آصفیہ' میں مثنوی اسم مؤنث منسوب بہ 'مثنیٰ' ہے جس کے معنی 'دو' کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہو، البتہ تمام اشعار ایک ہی بحر میں کہے گئے ہوں۔ مثنوی کے لیے ہزج، رمل، سریع، خفیف، متقارب اور متدارک وغیرہ میں سے کوئی بھی ایک بحر استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک بیانیہ صنفِ شاعری ہے جس میں عموماً فطری یا غیر فطری واقعات پر مبنی قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان قصوں میں خیال مربوط ہوتا ہے، بات سے بات نکلتی اور قصہ بتدریج آگے بڑھتا ہے۔ اس میں ہر طرح کا مضمون ادا کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے مولانا حالؔی کا کہنا ہے کہ اُردو شاعری کی جتنی بھی اصناف ہیں، ان میں سب سے کارآمد صنف مثنوی ہی ہے۔ اس میں داخلی اور خارجی اعتبار سے بلند پایہ شاعری کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ غزل کا شعر کم وقت میں بھی کہا جاسکتا ہے مگر مثنوی کہنے کے لیے مثنوی نگار کو کئی چیزوں کو پیش نگاہ رکھنا ہوتا ہے۔ مثلاً قلم اٹھانے سے پہلے ذہن میں مثنوی کا خاکہ مرتب کرنا، مستقل مزاجی کے ساتھ اسے تکمیل کو پہنچانا، واقعات کی ترتیب و تعمیر ایسی کرنا کہ قصہ مربوط رہے اور زبان ایسی استعمال کرنا جو پڑھنے والے کے لیے پے چیدگی اور الجھاؤ کا باعث نہ بنے بلکہ واقعات پر اس کی توجہ اور دلچسپی برقرار رہے وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مثنوی میں کچھ ایسے اشعار پائے جائیں جن کی دل کشی قاری کو اپنی جانب کھینچ لے تو اسے مثنوی کا عیب تصور کرنا چاہیے۔ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں رزم و بزم، اخلاق و فلسفہ اور عشقیہ قصے، غرض ہر طرح کے موضوعات منظوم انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔ مثنوی میں غزل کی طرح رمزیاتی و کنایاتی انداز بیان نہیں اپنایا جاتا بلکہ توضیحی انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے اور واقعات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے تاکہ واقعات

آسانی کے ساتھ قاری کے ذہن نشیں ہو جائیں۔ مثنوی میں چوں کہ ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، اس لیے اسے مثنوی کہا جاتا ہے۔ مثلاً:

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ

بہت حشمت و جاہ و مال و منال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال

کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج

ان اشعار میں بادشاہ، پناہ، منال، حال، باج اور خراج قافیہ ہیں جو ہر شعر میں جدا جدا ہیں۔ یہی صورت مطلع کی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے مثنوی کو مطلعوں کا مجموعہ بھی کہتے ہیں۔

9.3.2 مثنوی کے اجزائے ترکیبی

مثنوی بیانیہ صنفِ شاعری ہے۔ اس میں مربوط و مسلسل انداز میں کسی قصہ یا واقعہ کا بیان ہوتا ہے۔ اس قصے یا واقعے کو آگے بڑھانے کے لیے کرداروں کو وضع کیا جاتا ہے۔ قصے یا واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کا نام پلاٹ ہے۔ ایک مربوط پلاٹ اچھی مثنوی کا ضامن ہوتا ہے۔ مثنوی میں کرداروں کے جذبات بھی بیان ہوتے ہیں اور تہذیب و معاشرت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اس لیے مثنوی میں زبان اور اندازِ بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسلوب بیان، یہ سب مثنوی کے اجزائے ترکیبی کہلاتے ہیں۔ قدیم مثنویوں میں داستان کی طرح مافوق الفطری قصے، عشق و محبت کی داستانیں، جنگ اور مہم جوئی کے واقعات قلم بند کیے جاتے تھے۔ کچھ مثنویاں نصیحت آموز واقعات سے پُر ہوتی تھیں۔ اس لیے قدیم مثنویوں میں آٹھ، نو اجزائے ترکیبی ہوا کرتے تھے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

> ''قدیم رنگ کی مثنوی میں کئی جز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جاتی بلکہ شاعر حسب مرضی ان میں ترمیم کر لیتا ہے۔ نظم کی ابتدا حمد اور نعت سے ہوتی ہے۔ شیعہ حضرات منقبت حضرت علیؓ اور مدح ائمہ بھی لکھتے ہیں۔ مذہبی بزرگوں کی مدح و توصیف کے بعد شاعر کے مربی کی مبالغہ آمیز تعریف ہوتی ہے۔ یہ مربی بادشاہ، نواب، وزیر سے لے کر کوئی معمولی رئیس تک ہوسکتا ہے۔ بعض شعرا تعریف سخن یا تعریف خامہ یا مناجات عاشقانہ بھی

تحریر کردیتے ہیں لیکن یہ نہایت شاذ ہے۔مدحت طرازی کے بعد تالیف یا وجہ تصنیف کا جز وہوتا ہے۔اس سے مصنف اور مثنوی کے ماخذ کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔اس تمہید کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ بعض شعرا اس مقام پر ساقی نامہ لکھ دیتے ہیں۔..... مثنوی کے اخیر میں چند اشعار کا خاتمہ ہوتا ہے جس میں شاعر اپنی عرق ریزی کی داد چاہتا ہے یا خود ہی اپنی تعریف کر کے جی بہلا لیتا ہے یا بارگاہِ ایزدی میں اس دماغی ہفت خواں کے انجام ہونے پر تشکر پیش کرتا ہے یا پھر وہی آفاقی دل خوش کن تمنا کہ جس طرح اشخاص مثنوی کے دن پھرے ہیں، ہمارے تمہارے بھی دن پھریں۔''

(ڈاکٹر گیان چندجین، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، جلد اول، انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۵۹،۶۰)

ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق قدیم رنگ کی مثنوی کے اجزاے ترکیبی اس طرح ہیں:

۱۔ حمد

۲۔ نعت

۳۔ منقبت حضرت علیؑ اور مدح ائمہ

۴۔ مربی کی تعریف

۵۔ تعریف سخن یا تعریف خامہ یا مناجات عاشقانہ

۶۔ سبب تالیف یا وجہ تصنیف

۷۔ ساقی نامہ

۸۔ اصل قصہ یا داستان

۹۔ خاتمہ: اس مقام پر شاعر داد سخن چاہتا ہے یا بذات خود اپنی تعریف کرتا ہے۔

قدیم مثنویاں بہت حد تک ان اجزا کی پابند تھیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام مثنویوں میں اس کی پابندی کی گئی ہو۔جدید مثنویوں کا رنگ جداگانہ ہے کیوں کہ جدید مثنویوں کا انحصار صرف قصہ گوئی پہ نہ رہ کر معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کی عکاسی پر بھی ہے۔جدید مثنویوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قدیم رنگ کے ساتھ بلند آہنگی، دلی جذبات، ملکی رسمیں، خوشی وغم کی نمائندگی اور مذہبی وملی عقیدت، یہ تمام چیزیں صاف صاف نظر آتی ہیں۔قدیم وجدید کی بحث سے قطع نظر، مثنوی کے نمایاں اجزاے ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری، اصل قصہ اور اسلوبِ بیان اہم ہیں۔

پلاٹ: مثنوی میں پلاٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ پلاٹ جتنا مربوط ہوگا، مثنوی اتنی ہی کام یاب ہوگی۔ یعنی واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ واقعات کے بیان میں کہیں بھی بے ربطی یا بے ترتیبی مثنوی میں نقص پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے واقعات کے تسلسل کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور یہی چیز کہانی میں دل چسپی برقرار رکھنے کا باعث ہوتی ہے۔ شبلی نعمانی کے بقول حسن ترتیب ہی اصل شئے ہے جس پر مثنوی کی کام یابی کا دارو مدار ہوتا ہے اور اگر واقعات کا دروبست صحیح نہیں ہو یا اس میں لوچ ہو تو یہ مثنوی کی بڑی خامی ہے۔ یہاں حسن ترتیب سے مراد واقعات کے مابین منطقی ربط و تسلسل اور ربط کلام ہے۔

کردار نگاری: مثنوی بیانیہ شاعری ہے۔ اس میں کہانی بیان ہوتی ہے اور کہانی مختلف طرح کے کرداروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ کردار مختلف عمر اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ایک کردار کی اپنی صورت، شخصیت، اس کا جداگانہ انداز، رہن سہن اور انداز تکلم ہوتا ہے۔ مثنوی نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ جس کردار کا بیان کرے، اس کی تمام امتیازی خصوصیات کو قائم رکھے۔ یہ وصف مثنوی نگار کو کام یاب اور مثنوی کو پُر لطف بناتا ہے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے:

> ''پلاٹ کے علاوہ کردار نگاری پر بھی بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ خاص خاص کرداروں کو امتیازی خصوصیات کا مالک ہونا چاہیے۔ ایک کردار کا لب و لہجہ، طرز فکر و عمل، انداز قد دوسرے کردار سے مختلف ہونا چاہیے کیوں کہ زندگی میں یہی ہوتا ہے۔ مثنوی میں وہی کردار جاذبِ نظر اور موردِ توجہ ہوتے ہیں جن میں کوئی وصف مثلاً شوخی، ذکاوت و فطانت، وفاداری، انسانی ہمدردی، ایثار، رحم، بغض، کینہ، بے وفائی وغیرہ شدت سے ہو۔''
>
> (ڈاکٹر گیان چند جین، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، ص: ۸۳)

ایک اچھے اور کام یاب مثنوی نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کرداروں کی سیرت، اس کے مزاج اور اس کی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہو اور کرداروں کو برتنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہو کہ کس کردار سے کون سا کام لینا ہے۔ ورنہ مثنوی میں خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ بہترین کردار وہ مانے جاتے ہیں جو خیالی کے بجائے حقیقی معلوم ہوں اور اپنے عہد اور ماحول کی نمائندگی کرتے ہوں۔

واقعہ نگاری: شبلی نے واقعہ نگاری کو مثنوی کے لیے اہم مانا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ واقعہ نگاری میں کسی طرح کا نقص مثنوی کو بے جان کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قصے یا واقعے کے بیان کے وقت شاعر خصوصی توجہ سے کام لے۔ یہ واقعہ فطری ہو یا مافوق الفطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو یا فلسفیانہ، ہر جگہ بندش کی چُستی ہونی چاہیے۔ مثنوی کا ایک اہم وصف صراحت و وضاحت ہے۔ مثنوی میں واقعات کے بیان میں مقام اور زمان کے علاوہ مواقع، ماحول، مناظر اور نفسیاتی کیفیات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں شاعر کی قوت

متخیلہ جتنی زیادہ بلند ہوگی، مثنوی اتنی ہی عمدہ اور پُر لطف ہوگی۔ مثنوی نگار مثنوی میں بیانیہ، توضیحی اور نفسیاتی شاعری کے علاوہ غنائی اور طربیہ شاعری کے دل کش نمونے بھی پیش کرسکتا ہے۔ واقعات کے بیان میں شاعر کا ڈرامائی طرزِ اظہار اسے عمدہ بناتا ہے۔ اس لیے شاعر بیان واقعہ میں مکالموں کا سہارا لیتا ہے اور مکالموں میں روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کا سا حسن پیدا کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈرامے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

جذبات نگاری: جذبات نگاری بھی مثنوی کا اہم جزو ہے۔ کام یاب اور بہتر مثنوی وہ مانی جاتی ہے جس میں کرداروں کی عمر، جنس، منصب اور طبقے کے اعتبار سے ان کے جذبات کا بیان فطری اور دل چسپ انداز میں کیا گیا ہو تا کہ قاری کو ان پر حقیقی ہونے کا گمان گزرے۔ جذبات کی مرقع کشی مثنوی میں حیرت انگیز دل کشی اور اثر انگیزی پیدا کرتی ہے۔

منظر نگاری: مثنوی میں کسی مقام کے حسن یا ویرانی کے بیان یا بعض موثر اوقات کی تصویر کشی کرنے کو منظر نگاری کہتے ہیں۔ مقامات، ماحول اور اوقات کا بیان جتنا دل کش اور پُر لطف ہوگا، مثنوی اتنی ہی کام یاب اور دل چسپ ہوگی۔ مثنوی نگار منظر نگاری کے ذریعے مثنوی میں سماں باندھ دیتا ہے اور قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ حسین منظر نگاری جمالیاتی کیفیت پیدا کرتی ہے اور قصے یا واقعے کو بھی دل چسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسلوب بیان: صنفِ مثنوی میں زبان و بیان کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ زبان جتنی سادہ، صاف، سلیس اور اندازِ بیان جتنا دل پذیر ہوگا، مثنوی اتنی ہی عمدہ اور دل چسپ ہوگی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

> ”معنی کے ساتھ ساتھ طرزِ اظہار بھی دل کش ہونا چاہیے۔ جمالیاتی پہلو طرزِ اظہار اور اسلوبِ بیان سے زیادہ وابستہ ہے۔ اگر ظاہر خراب ہوگا تو باطن کا حُسن گدڑی کے لعل کی طرح پوشیدہ رہے گا۔ اچھی مثنوی کی زبان نہایت صاف اور رواں ہونی چاہیے۔ جذبات نگاری اور شستہ زبان یہی دو خاص اوصاف ہیں جن پر مثنوی کے مرتبہ کا انحصار ہوتا ہے۔ اُردو کے تمام اچھے مثنوی گو زبان کے فن کار ہیں۔ شمالی ہند میں اُردو کی بہترین مثنویاں میرؔ، میر حسنؔ، نسیمؔ اور شوقؔ لکھنوی کی ہیں۔ ان چاروں میں صنّاعیِ زبان وصفِ مشترک ہے۔ ان کے ہم عصروں میں کوئی دوسرا مثنوی نگار ان سے بہتر زبان نہ لکھ سکا۔“

(ڈاکٹر گیان چند جین، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، ص:۸۱،۸۲)

مثنوی کو شاہ کار بنانے میں زبان اور اندازِ بیان کا اہم کردار ہوتا ہے۔ مثنوی میں پر تکلف زبان و بیان کے مقابلے میں سادہ و سلیس اسلوب زیادہ موثر ہوتا ہے۔ کام یاب مثنوی نگار صناعی پر وقت صرف نہیں کرتے بلکہ شعری

نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا خیال رکھتے ہوئے منفرد اسلوب اور طرز بیان اپناتے ہیں اور کرداروں سے اس کے حسب حال الفاظ ادا کراتے ہیں جس سے مثنوی میں لطافت و دل کشی پیدا ہوتی ہے۔ مثنوی میں زبان انتہائی صاف ستھری، شستہ، سلیس اور دل کش ہونی چاہیے تاکہ واقعات کا بیان دل چسپ ہو اور قاری کی توجہ واقعات پر مرکوز رہے۔

9.3.3 مثنوی کی فنی خصوصیات

صنفِ مثنوی فارسی ادب سے مستعار ہے۔ عربی میں اس کا وجود نہیں تھا۔ اُردو میں مثنوی کا آغاز دکن سے ہوا۔ اُردو کی ابتدائی مثنویاں صوفیائے کرام کے ذریعے وجود میں آئیں اور مذہبی موضوعات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئیں۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، مناجات اور مدح حاکم اور کوئی قصہ ہوتا تھا۔ اس طرح ابتدائی دور کی مثنویوں کے موضوعات دین کی تبلیغ، پند و نصائح اور اخلاقیات سے معمور ہیں یعنی ابتدائی دور میں اس کے موضوعات پر مذہب کی چھاپ رہی۔ آگے چل کر عشق و محبت مثنوی کا محبوب اور حاوی موضوع قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں زیادہ تر مثنویاں عشقیہ قصوں اور مہمات کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ کچھ اُردو مثنویوں کے موضوعات رزمیہ بھی رہے ہیں۔ چوں کہ اُردو مثنوی فارسی کے زیرِ اثر پروان چڑھی، اس لیے اُردو مثنوی نے فارسی مثنوی کے رنگ کو اپنایا جس کا ایک پہلو رزم بھی ہے۔ اُردو کی رزمیہ مثنویوں میں نصرتیؔ کی 'علی نامہ'، رستمیؔ کی 'خاور نامہ' اور حسن شوقیؔ کی 'ظفر نامہ' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے بعد اُردو میں رزمیہ مثنوی کا قحط سا دکھائی دیتا ہے۔ اُردو کی جدید مثنویاں قدیم مثنویوں سے کچھ حد تک منفرد ہیں۔ اس میں تاریخی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور عشقیہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ امداد امام اثرؔ نے موضوعات کے لحاظ سے مثنوی کی تقسیم اس طرح کی ہے:

۱۔ رزمی مضامین

۲۔ بزمی مضامین

۳۔ حکمت آموز مضامین

۴۔ تصوف آمیز مضامین

۵۔ متفرق مضامین

گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں' میں مثنوی کی تقسیم درج ذیل انداز میں کی ہے:

۱۔ مذہبی مثنویاں

۲۔ تاریخی مثنویاں

۳۔ وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔

۴۔ وہ مثنویاں جو ہندوستان کے فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں ہیں۔

۵۔ وہ مثنویاں جن میں حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

۶۔ ہندوستانی قصے، کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں جن کا تعلق ان قصوں سے ہے جو ہندوستان کی قدیم روایتوں اور لوک کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کو جس طرح یہاں تقسیم کیا گیا ہے، اس سے یہ قطعی نہیں سمجھنا چاہیے کہ مثنوی کا دائرہ محدود ہے۔ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے لیے موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس میں مختلف قسم کے موضوعات اور متفرق مضامین کو سمیٹنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ اُردو میں زیادہ تر مثنویاں عشقیہ موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اُردو مثنوی کا اصل دائرہ داستان عشق کا بیان ہے اور اس کی رنگینی کی توضیح اس کا خاصہ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی ایک منظّم داستان عشق ہے جس میں عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ متعلقہ علاقے کے رسم و رواج، تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے نقوش صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔

مثنوی کے فن میں واقعات کی ترتیب و تنظیم، تسلسلِ خیال، مربوط بیان، سلاستِ زبان اور کسی خاص موضوع اور مسئلے کو ارتقائی منازل تک پہنچانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شبلی نعمانی نے مثنوی کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیل، ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آ سکتا۔..... اس آسانی اور وسعت کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی کا ہر شعر علاحدہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ پابندی نہیں ہوتی کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں ادا کی جائے جیسا کہ غزل اور قصیدہ میں یہ لازمی ہے۔ مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں۔ اس لیے جس قدر وسعت دینا چاہیں، دے سکتے ہیں۔ مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ رزمیہ، عشقیہ، تصوف، فلسفہ، واقعہ نگاری، جو مضمون چاہیں، مثنوی میں ادا کر سکتے ہیں۔''
>
> (شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ چہارم، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۹۵، ۱۹۶)

مثنوی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں عشقیہ واقعات کے بیان کو اولیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے مثنوی میں زندگی کے تمام پہلو داخل ہو جاتے ہیں اور پورے معاشرتی نظام اور انسانی جذبات جیسے عشق و محبت،

رنج وغم، غیض وغضب اور کینہ وانتقام وغیرہ کا عکس صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ مثنوی میں مناظرِ فطرت جیسے بہار وخزاں، گرمی وسردی، صبح وشام، جنگل و بیابان اور کوہ وصحرا وغیرہ کے مناظر کی جھلک اور حسین تصویر کشی جس طرح دیکھنے کو ملتی ہے، اس طرح اُردو کی کسی اور صنفِ شاعری میں نظر نہیں آتی۔

مثنوی کا فن مربوط فکر وخیال، احساسِ تناسب، واقعات کی ترتیب وتنظیم اور قصے کی تشکیل کا فن ہے۔ یہ فن بہت زیادہ توجہ، محنت، غور وفکر اور مسلسل انہماک چاہتا ہے۔ مثنوی کی پہلی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔ خواہ وہ واقعہ فطری ہو یا مافوق فطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو، مذہبی ہو یا فلسفیانہ۔ مثنوی کی دوسری خصوصیت منفرد اسلوب اور طرزِ بیان ہے جس میں زبان کی سلاست وروانی کے ساتھ شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا کمال دکھانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ مثنوی کا تیسرا وصف وضاحت وصراحت ہے۔ اس کے تحت زمان ومکاں کے علاوہ مواقع، ماحول، مناظر اور کرداروں کی نفسی کیفیات کا بیان بھی شامل ہے۔ مثنوی کا چوتھا اہم وصف ڈرامائی طرزِ اظہار ہے۔ مثنوی نگار مکالماتی انداز بھی اپناتا ہے۔ جب مکالموں میں وہ روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈرامے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ مثنوی میں مقصد بھی بڑی اہم چیز ہے جس کی بنیاد پر شاعر عمارت کھڑی کرتا ہے۔ بعض اوقات اس میں نقص آنے پر اس کے معیار میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ اس لیے شاعر اپنا زورِ تخیل بروے کار لاتے ہوئے اس میں زیادہ محنت صرف کرتا ہے۔ مثنوی کا مقصد مذہبی اور اخلاقی بھی ہوسکتا ہے اور معاشرتی، صوفیانہ اور فلسفیانہ بھی۔ اس طرح مثنوی دل چسپ فن ہونے کے ساتھ ساتھ کارآمد اور کسی قدر پے چیدہ فن ہے۔ اس فن کو اُردو کے بیش تر ناقدین نے اہمیت کا حامل بتایا ہے۔

9.3.4 ماحصل

مثنوی اس طویل نظم کا نام ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ ربط وتسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں رزم وبزم، اخلاق وفلسفہ اور عشق، غرض ہر طرح کے موضوعات نظم کیے جاتے ہیں۔ مثنوی میں غزل کی طرح رمزیاتی وکنایاتی انداز بیان نہیں اپنایا جاتا بلکہ توضیحی طرزِ اظہار اختیار کیا جاتا ہے اور واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے تاکہ واقعات آسانی کے ساتھ قاری کے ذہن نشیں ہوجائیں۔ مثنوی میں قصے یا واقعے کو آگے بڑھانے کے لیے کرداروں کو وضع کیا جاتا ہے۔ کرداروں کے بیان کو کردار نگاری کہا جاتا ہے۔ قصے یا واقعات کو ربط وتسلسل کے ساتھ بیان کرنے کا نام پلاٹ ہے۔ ایک مربوط پلاٹ اچھی مثنوی کا ضامن ہوتا ہے۔ مثنوی میں کرداروں کے جذبات بھی بیان ہوتے ہیں اور تہذیب ومعاشرت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اس لیے مثنوی میں زبان اور اندازِ بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسلوبِ بیان، یہ سب مثنوی کے اجزائے ترکیبی کہلاتے ہیں۔ مثنوی میں کسی خاص

موضوع اور مسئلے کو ارتقائی منازل تک پہنچانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مثنوی کا فن بہت زیادہ توجہ، محنت، غور وفکر اور مسلسل انہماک چاہتا ہے۔ مثنوی کی پہلی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔ خواہ وہ واقعہ فطری ہو یا مافوق فطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو، مذہبی ہو یا فلسفیانہ۔ مثنوی کی دوسری خصوصیت منفرد اسلوب اور طرزِ بیان ہے جس میں زبان کی سلاست و روانی کے ساتھ شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا کمال دکھانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ مثنوی کی کام یابی کا دارومدار تسلسلِ بیان اور مربوط فکر پر ہے۔ اس لیے شاعر کی توجہ واقعات کے ارتقا، ترتیب و تنظیم اور ربط پہ ہونی چاہیے۔ مثنوی کا تیسرا وصف وضاحت وصراحت ہے۔ اس کے تحت زمان ومکاں کے علاوہ مواقع، ماحول، مناظر اور کرداروں کی نفسی کیفیات کا بیان بھی شامل ہے۔ مثنوی کا چوتھا اہم وصف ڈرامائی اندازِ بیان ہے۔ مثنوی نگار مکالماتی انداز بھی اپناتا ہے۔ جب مکالموں میں وہ روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈرامے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ مثنوی میں مقصد بھی بڑی اہم چیز ہے جس کی بنیاد پر شاعر عمارت کھڑی کرتا ہے۔ یہ مقصد مذہبی اور اخلاقی بھی ہوسکتا ہے اور معاشرتی، صوفیانہ اور فلسفیانہ بھی۔ اس طرح مثنوی دل چسپ فن ہونے کے ساتھ ساتھ کارآمد اور کسی قدر پیچیدہ فن ہے۔ اس فن کو اُردو کے بیش تر ناقدین نے اہمیت کا حامل بتایا ہے۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف سے واقفیت حاصل کی۔
- مثنوی کے اجزاے ترکیبی کو سمجھا۔
- مثنوی کے فن سے بحث کی۔
- مثنوی کے فن کی خصوصیات و امتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- مثنوی کے فن کی انفرادیت اور اہمیت کو سمجھا۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مثنوی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف بیان کیجیے۔

۲۔ مثنوی کے اجزاے ترکیبی کیا کیا ہیں؟

۳۔ مثنوی میں منظر نگاری سے بحث کیجیے۔

۴۔ مثنوی اور غزل کے درمیان فرق کو واضح کیجیے۔

۵۔ مثنوی کے فن پر اظہارِ خیال کیجیے۔

9.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مثنوی کا لفظ عربی کے لفظ 'مثنیٰ' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں دو دو کے یا دو کیا گیا وغیرہ۔ شعری اصطلاح میں مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہو، البتہ تمام اشعار ایک ہی بحر میں کہے گئے ہوں۔

۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی پلاٹ، کردار نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسلوبِ بیان ہیں۔

۳۔ مثنوی میں کسی مقام کے حسن یا ویرانی کے بیان یا بعض موثر اوقات کی تصویر کشی کرنے کو منظر نگاری کہتے ہیں۔ مقامات، ماحول اور اوقات کا بیان جتنا دل کش اور پُر لطف ہوگا، مثنوی اتنی ہی کام یاب اور دل چسپ ہوگی۔ مثنوی نگار منظر نگاری کے ذریعے مثنوی میں سماں باندھ دیتا ہے اور قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ حسین منظر نگاری جمالیاتی کیفیت پیدا کرتی ہے اور قصے یا واقعے کو بھی دل چسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۴۔ مثنوی اور غزل موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے شاعری کی جداگانہ اصناف ہیں۔ غزل منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مثنوی میں مربوط فکر اور تسلسلِ بیان سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ غزل کا فن غنائی اور ایمائی ہوتا ہے۔ جب کہ مثنوی کا فن بیانیہ اور توضیحی ہوتا ہے۔ غزل میں واقعہ نگاری نہیں ہوتی جب کہ یہ مثنوی کی جان ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں جب کہ مثنوی میں ہر شعر کا قافیہ الگ الگ ہوتا ہے۔

۵۔ مثنوی کا فن مربوط فکر و خیال، احساسِ تناسب، واقعات کی ترتیب و تنظیم اور قصے کی تشکیل کا فن ہے۔ یہ فن بہت زیادہ توجہ، محنت، غور و فکر اور مسلسل انہماک چاہتا ہے۔ مثنوی کی پہلی خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔ خواہ وہ واقعہ فطری ہو یا مافوق فطری، رزمیہ ہو یا بزمیہ، اخلاقی ہو، مذہبی ہو یا فلسفیانہ۔ مثنوی کی دوسری خصوصیت منفرد اسلوب اور طرزِ بیان ہے جس میں زبان کی سلاست و روانی کے ساتھ شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کا کمال دکھانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ مثنوی کا تیسرا وصف وضاحت و صراحت ہے۔ اس کے تحت زمان و مکاں کے علاوہ مواقع، ماحول، مناظر اور کرداروں کی نفسی کیفیات کا بیان بھی شامل ہے۔ مثنوی کا چوتھا اہم وصف ڈرامائی طرزِ اظہار ہے۔ مثنوی نگار مکالماتی انداز بھی اپناتا ہے۔ جب مکالموں میں وہ روزمرہ اور محاوروں کے ذریعے بات چیت کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور متکلم کی حیثیت کو ملحوظ رکھتا ہے تو مثنوی میں ڈرامے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں مقصد بھی بڑی اہم چیز ہے جس کی بنیاد پر شاعر عمارت کھڑی کرتا ہے۔ بعض اوقات اس میں نقص آنے پر اس کے معیار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس لیے شاعر اپنا زورِ تخیل بروئے کار لاتے ہوئے اس میں زیادہ محنت صرف کرتا ہے۔ مثنوی کا مقصد مذہبی اور اخلاقی بھی ہو سکتا ہے اور معاشرتی، صوفیانہ اور فلسفیانہ بھی۔ اس طرح مثنوی دل چسپ فن ہونے کے ساتھ ساتھ کار آمد اور کسی

قدر پے چیدہ فن ہے۔اس فن کو اُردو کے بیش تر ناقدین نے اہمیت کا حامل بتایا ہے۔

9.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
مثنوی	:	دو دو والا، نظم کی ایک قسم جس میں کوئی مسلسل بات بیان کی جاتی ہے۔اس میں ہر شعر کا قافیہ جدا لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی
مثنیٰ	:	دو دو
رزمیہ	:	جنگ یا جنگی مہم جوئی سے متعلق
بزمیہ	:	محفل یا مجلس عیش و طرب سے متعلق
رمز	:	اشارہ، ایما
کنایہ	:	اشارہ، ایما، مبہم بات
گیتی پناہ	:	بادشاہ
مستعار	:	اُدھار لینا
حشمت	:	شان و شوکت، دبدبہ
جاہ	:	رتبہ، منصب، عزت، قدر و منزلت
منال	:	مال و اسباب، دھن دولت
فرخندہ	:	مبارک، سعید
باج	:	محصول، خراج، زر مال گذاری
خطا	:	چین کا ایک شہر جو مشک کے لیے مشہور ہے، بھول چوک، غلطی
در و بست	:	جوڑ، ترتیب، نظم، بندش

9.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

۲۔ اُردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں : سید محمد عقیل رضوی

۳۔ جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں : کندن لال کندن

۴۔ اُردو کی تین مثنویاں : پروفیسر خان رشید

۵۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں : پروفیسر گیان چند جین

اکائی 10 مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

10.3.1 مثنوی کے موضوعات

10.3.2 مثنوی کی اقسام

10.3.3 ماحصل

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالوں کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مثنوی کے موضوعات سے واقف ہوں گے۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کو سمجھیں گے۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنوی نگاروں سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات وامتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- جدید دور میں مثنوی کے موضوعات میں جو تبدیلی آئی، اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات سے واقف ہوئے۔ آپ نے یہ معلومات بھی حاصل کیں کہ مثنوی کلاسیکی اُردو شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔ اب اس اکائی میں آپ

مثنوی کے موضوعات، اس کی مختلف اقسام کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے، مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنوی نگاروں اور نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات سے واقف ہوں گے اور جدید دور میں اُردو مثنوی کے موضوعات میں جو تبدیلی آئی ہے، اسے سمجھیں گے۔

10.3 مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

10.3.1 مثنوی کے موضوعات

اصناف شاعری میں غزل کی طرح ہی مثنوی بھی مقبول صنفِ سخن رہی ہے۔ مثنوی بیانیہ اور توضیحی صنفِ شاعری ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے مثنوی اپنے اندر بے حد گنجائش رکھتی ہے۔ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ غیر معمولی سے معمولی چیز تک اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز، ہر طرح کے داخلی و خارجی مضامین کو مثنوی اپنے اندر سمونے کی اہلیت رکھتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب 'شعرالعجم' میں صنفِ مثنوی کے بارے میں لکھا ہے:

''انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخئیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔ مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں، سب اس میں آجاتے ہیں۔ عشق و محبت، رنج و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں، سب کے یہاں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ تاریخ میں مختلف اور گونا گوں واقعات پیش آتے ہیں، اس لیے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔ مناظرِ قدرت، بہار و خزاں، گرمی و سردی، صبح و شام یا جنگل و بیابان، کوہ و صحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔۔۔۔ مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں، اس لیے جس قدر وسعت دینا چاہیں، دے سکتے ہیں۔ مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں؛ رزمیہ، عشقیہ، تصوف، فلسفہ، واقعہ نگاری جو مضمون چاہیں، مثنوی میں ادا کر سکتے ہیں۔''

(علامہ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۰۵، ۲۰۶)

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

صنفِ مثنوی کے سلسلے میں خواجہ الطاف حسین حالی کی رائے ہے کہ:

''مثنوی اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے کیوں کہ غزل یا قصیدے میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے، ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔..... الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اُردو شاعری میں متداول ہیں، ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔''

(خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمۂ شعر و شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۰۲، ۲۰۳)

امداد امام اثر صنفِ مثنوی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنفِ شاعری کو حاصل ہے، کسی اور صنف کو نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں۔......
یہ وہ صنفِ شاعری ہے جس میں شاعر شاعری کا کمال حسب مراد دکھلا سکتا ہے۔''

(امداد امام اثرؔ، کاشف الحقائق، مرتبہ، وہاب اشرفی، ترقی اُردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۲ء، ص: ۵۵۹، ۵۶۰)

مذکورہ اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مثنوی کے لیے موضوعات کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ شاعر جس موضوع پر چاہے مثنوی لکھ سکتا ہے۔ بیانیہ حکایتیں، تصوف و اخلاقیات، عقائد و کلام، تفسیر و فقہ، ہجو و مدح، طنز و مزاح، سیاست و صحافت، مکتوب و آپ بیتی، علوم و فنون، ساقی نامہ، بارہ ماسہ، عشق و عاشقی کی داستان، پریوں، دیوزادوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے دل فریب قصے، رسم و رواج یہاں تک کہ نحو و صرف کی مثالیں اور بچوں کا ادب، ایسا کون سا موضوع ہے جسے مثنوی کی ہیئت میں نظم نہیں کیا گیا ہو۔ مذہبی واقعات، پند و نصائح، داستان حسن و محبت، میدان جنگ کی معرکہ خیزی، بزمِ طرب کی دل آویزی، رسوماتِ شادی و بیاہ، حیرت انگیز مافوق الفطری واقعات اور تاریخ کے علاوہ شہر آشوب سبھی کچھ مثنویوں کا موضوع ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کے مضامین میں بڑی وسعت اور تنوع ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اُردو میں مثنوی کو عشقیہ موضوعات زیادہ راس آئے اور شعرائے اُردو نے اس موضوع پر شاہ کار تخلیقات پیش کیں۔ مُلّا وجہیؔ کی مثنوی 'قطب مشتری' سراجؔ اورنگ آبادی کی مثنوی 'بوستان خیال' میر تقی میرؔ کی مثنوی 'دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' میر حسنؔ کی مثنوی 'سحر البیان' میر اثرؔ کی مثنوی 'خواب و خیال' دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی 'گلزار نسیم' نواب مرزا شوقؔ کی مثنوی 'زہر عشق' اور داغؔ دہلوی کی مثنوی 'فریاد داغ'، جیسی مشہور

مثنویاں بنیادی طور پر عشقیہ موضوعات پر مبنی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اُردو میں صنفِ مثنوی کا بنیادی موضوع عشق رہا ہے۔ اُردو مثنوی نگاروں نے ہر عہد میں زیادہ تر چند مخصوص موضوعات کو ہی عزیز جاں بنائے رکھا۔ اُردو اور فارسی کی اہم مثنویوں پر غور کریں تو عشق و عاشقی کی داستان بیان کرنے والی، رزمیہ، حکمت وفلسفہ، اخلاق و آداب نیز مذہبی موضوعات کو پیش کرنے والی مثنویوں کی تعداد دیگر موضوعات پر لکھی گئی مثنویوں سے کہیں زیادہ ہے۔

مثنوی کے موضوعات کے اسی تنوع کے پیش نظر اُردو کے اہم ناقدین نے موضوع کے لحاظ سے اس کی تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے رزمیہ، عشقیہ، اخلاقی قصہ وافسانہ، تصوف وفلسفہ کے تحت اُردو مثنوی کی تقسیم کی ہے۔ امداد امام آثر نے رزم، بزم، حکمت، تصوف اور دیگر متفرقات کے طور پر مثنویوں کی موضوعاتی تقسیم کی ہے جب کہ گیان چند جین نے موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کی تقسیم کو پے چیدہ عمل قرار دیا ہے اور ایسی تقسیم کو غیر مستحسن قرار دیا ہے۔ البتہ انھوں نے اُردو کی طویل مثنویوں میں برتے گئے موضوعات کی فہرست سازی یوں کی ہے:

> ''اُردو میں ذیل کے موضوعات پر طویل مثنویاں لکھی گئیں۔ ا۔ دیو و پری کی داستانیں جن میں عشق کا نمایاں مقام ہے۔ ۲۔ واردات عشق، ان میں قصہ کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ ۳۔ معرفت، ۴۔ مذہب، ۵۔ تاریخ وسوانح، ۶۔ رزم، ۷۔ اخلاق وفلسفہ۔ جدید دور میں ملی، قومی اور سماجی مسائل، مناظرِ قدرت پر بھی مثنویاں لکھی گئیں۔ شاذ ونادران موضوعات کے علاوہ بھی مثنویاں لکھی گئیں۔ مثلاً کھٹمل، پسّو، مچھر وغیرہ کی مذمت میں لیکن یہ متنوع موضوعات مختصر مثنویوں تک محدود رہے۔''
>
> (ڈاکٹر گیان چند جین، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، ص: ۹۰)

اُردو کے اہم نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں' میں مقامی موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کو چھے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) مذہبی مثنویاں (۲) تاریخی مثنویاں (۳) معاشرتی کوائف و آثار سے متعلق مثنویاں (۴) فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں مثنویاں (۵) حب الوطنی سے متعلق مثنویاں (۶) ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں۔

مذکورہ بالا تفصیلات موضوع کے اعتبار سے مثنوی کی متعدد اقسام پر روشنی ڈالتی ہیں۔ حالاں کہ ایسی تقسیم بہت کارآمد نہیں ہوسکتی ہے کیوں کہ ایک ہی مثنوی کئی کئی موضوعات پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔ کبھی ایک مثنوی عشق کے جذبات کو بیان کرتی ہے تو وہیں تصوف وسلوک کے موضوعات کو بھی پیش کرتی ہے۔ کوئی مثنوی تاریخی واقعات پر

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

مبنی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں رزم و بزم کا بیان بھی موجود ہے۔ ایسی بہت سی مثنویاں مل جائیں گی جن میں کسی ایک مخصوص موضوع کے بجائے کئی موضوعات شامل ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی ایک موضوع حاوی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا موضوع متعین کیا جاتا ہے۔

10.3.2 مثنوی کی اقسام

اخلاقی مثنویاں: اُردو کی بیش تر ابتدائی مثنویاں مذہب وتصوف سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے انھیں مذہبی یا متصوفانہ مثنویاں کہا جاتا ہے۔ ایسی مثنویوں کو اخلاقی مثنویوں کے ذیل میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ان مثنویوں کا موضوع تصوف، مذہبی تعلیمات اور انسانی و اخلاقی اقدار رہا ہے۔ مثنوی کے ابتدائی نمونوں کے تعلق سے عبدالسلام ندوی نے قطب شاہ کی ایک نعتیہ مثنوی کا ذکر کیا ہے جب کہ بعض لوگوں نے ملا وجہی کی 'قطب مشتری' کو باضابطہ ابتدائی نمونہ تسلیم کیا ہے۔ حالاں کہ بعد میں سامنے آنے والی تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے اور تحقیق کاروں نے بتایا ہے کہ مثنوی کے جو قدیم ترین نمونے ملتے ہیں، وہ بابا شیخ فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ اسی طرح بعض محققین نے حضرت امیر خسرو کے کلام کے بعض حصوں کو مثنوی کے اولین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ کچھ محققین نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ بہاؤالدین برناوی اور سید ہاشم حسینی علوی کے ملفوظات میں مثنوی کے ابتدائی نقوش کی نشان دہی کی ہے۔ ان تمام ابتدائی نمونوں کا نمایاں موضوع مذہب اور تصوف ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق حسن و عاشقی کے موضوع پر پہلی طویل مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے۔ مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے قبل یا اس کے آس پاس کئی اہم مثنویاں وجود میں آچکی تھیں۔ اشرف بیابانی کی مثنوی 'نوسر ہار' یا پھر 'واحد باری' کا موضوع مذہب ہی ہے۔ 'واحد باری' کی تخلیق اشرف بیابانی نے امیر خسرو کے کلام 'خالق باری' کے طرز پر کی تھی۔ خوب محمد چشتی کی 'خوب ترنگ' اور شاہ میراں جی کی 'خوش نامہ' ابتدائی دور کی مثنویاں ہیں جن میں مذہبی و متصوفانہ موضوعات کو برتا گیا ہے۔ محبوب عالم شیخ محمد جیون کی مثنویاں 'محشر نامہ'، 'دردنامہ'، 'خواب نامہ پیغمبر' اور 'دھیر نامہ بی بی فاطمہ' مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جہاں 'محشر نامہ' میں مذہبی عقائد و فقہی مسائل کا ذکر ہے، وہیں 'دردنامہ' میں رسول دو عالم ﷺ کی ولادت باسعادت اور وفات کا ذکر ملتا ہے۔ منیر شکوہ آبادی، محسن کاکوروی اور جگن ناتھ خوشتر وغیرہ نے مذہبی رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی مثنویاں تحریر کی ہیں۔ اُردو کے اہم مثنوی نگار میر حسن کی مثنوی 'رموز العارفین' مکارم اخلاق اور معارف وحکمت کے مضامین سے پُر ہے۔ اس مثنوی کے تعلق سے ایک اہم بات یہ کہی جاتی ہے کہ میر حسن نے 'منطق الطیر' اور مولانا روم کی مثنوی سے اثر قبول کیا ہے۔ اس لیے اس رنگ کے متعدد اشعار اس مثنوی کی زینت ہیں۔ مظفر علی اسیر کی مثنویاں 'معراج الفضائل'، 'ریاض المسلمین' اور 'خلاصۃ التقویٰ' مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ تینوں طویل مثنویاں ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر اُردو کے اہم مرثیہ گو شاعر ہیں۔ ان کی مثنوی 'احسن القصص' دراصل رسول اللہ ﷺ اور اماموں کے حالاتِ زندگی اور فضائل و کمالات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں نعتیہ اشعار ہیں اور

جنگ کے منظرنامے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

دکن کے بہت سے شعرانے مذہب وتصوف اوراسلامی اقداروشخصیات کے تناظر میں مثنویاں لکھی ہیں۔اس لیے بلاتردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ابتدائی دور کی اُردومثنویوں میں مذہبی موضوعات کثرت سے آئے ہیں۔اُردو میں اسلامی افکاروخیالات کے ساتھ ساتھ تصوف وسلوک کے موضوعات نیز دیگر مذاہب جیسے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کونظر میں رکھ کربھی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعد کے ادوار میں بھی شعرا نے ان موضوعات کو برتنے سے گریزنہیں کیا ہے۔اس لحاظ سے اُردومثنویوں میں مذہبی اورمتصوفانہ مثنویوں کی تعداد خاصی ہے۔

داستانوی اورعشقیہ مثنویاں: اُردو میں زیادہ تر عشقیہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علمائے ادب نے عشقیہ داستان کومثنوی کا بنیادی موضوع قرار دیا ہے۔ان عشقیہ مثنویوں کو داستانوی مثنویوں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔اُردومثنویوں میں داستان طرازی کا انداز واسلوب مختلف ضرور رہا ہے لیکن چاہے طبع زاد مثنویاں ہوں یا پھرکسی دوسری زبان سے ترجمہ شدہ ہوں، ان سب کے قصوں کا مرکزی نکتہ عشق ہی رہا ہے۔ مشہورناقد پروفیسرابوالکلام قاسمی اپنے مضمون 'اُردوشاعری کی کلاسیکی شعریات' میں رقم طراز ہیں:

> ''کہا جاتا ہے کہ مثنوی کا اصل مزاج داستانِ عشق کا بیان ہے۔چوں کہ مثنوی کی صنف میں شروع سے ہی عام موضوعات سے کچھ زیادہ داستان کا عنصر شامل ہوگیا تھا،اس لیے واقعات اور بیانیہ کا استعمال اس کے اجزا میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگیا مگراس کے ساتھ ہی عشق کے جذبات واحساسات اوران کی جزئیات کوبھی مثنوی کے اہم اجزا میں شامل تصور کیا جانے لگا۔مثنوی کو بیانیہ شاعری کی معراج بھی کہا جاتا ہے جس میں ہرخارجی مظہر یا واقعاتی بیان،انسان کی داخلی کیفیات اورمربوط یا پے چیدہ جذبات کاعکس بن کرنمودار ہوتا ہے۔''
>
> (اُردوشاعری کی کلاسیکی شعریات، مشمولہ، سہ ماہی فکروتحقیق، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۷ء،قومی کونسل برائے فروغ اُردوزبان،نئی دہلی،ص:۱۵،۱۶)

وزیرآغا نے اپنی تصنیف 'اُردوشاعری کا مزاج' میں مثنوی کومحبت کی داستان بیان کرنے والی سب سے کارآمد صنفِ سخن قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''مثنوی کا اصل مقصد محبت کی داستان کو بیان کرنا ہے۔اگرمثنوی کومختلف ومتنوع خارجی موضوعات کے لیے برتا جائے یا عشقیہ داستان کے بیان میں محض واقعات

کے بیان کو تمام تر اہمیت تفویض کردی جائے تو اس سے مثنوی کا اصل مزاج مجروح ہوتا ہے۔''

(وزیر آغا، اُردو شاعری کا مزاج، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص: ۳۱۸)

بعض ناقدین نے مثنوی کو داستان عشق کے بیان کے لیے خاص گردانا ہے اور یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ جس مثنوی میں داستان عشق کا بیان نہ ہو، وہ مثنوی نہیں کہی جاسکتی ہے۔ حالاں کہ یہ بات درست نہیں ہے کیوں کہ اُردو مثنوی میں ابتدا سے ہی کسی خاص موضوع کی پابندی نہیں رہی ہے۔ مشہور محقق گیان چندجین نے بھی مثنوی کی موضوعاتی تخصیص سے انکار کیا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میرتقی میرؔ سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالیؔ تک کی تمام اہم مثنویوں کا غالب موضوع عشق ہی ہے۔ غواصیؔ کی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' ابن نشاطیؔ کی 'پھول بن' ملا وجہیؔ کی 'قطب مشتری' یا دکن کے دیگر شعرا کی مثنویاں اٹھا کر دیکھیے تو اس میں عشق و عاشقی کی داستان اور الفت ومحبت کے جذبات سے پُر منظرنامے نظر آئیں گے۔ شمالی ہند کے شعرا نے بھی اس موضوع پر بہت سی مثنویاں لکھی ہیں۔ سوداؔ، میر سوزؔ، میرتقی میرؔ، قائمؔ چاند پوری، میر اثرؔ، مومنؔ، ذوقؔ، رنگینؔ، میر حسنؔ، دیا شنکر نسیمؔ اور مرزا شوقؔ لکھنوی وغیرہ کی مثنویاں عشقیہ بیانات وواقعات سے پُر ہیں۔

میر تقی میرؔ اُردو کے عظیم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے تیس سے زائد مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کی نمائندہ مثنویوں کے موضوعات پر نظر ڈالیں تو ان میں سے بیش تر عشق ومحبت کے رنگ میں ہیں۔ 'شعلۂ عشق'، 'معاملاتِ عشق'، 'جوشِ عشق' اور 'دریائے عشق' جیسی ان کی اہم مثنویوں کا بنیادی موضوع حسن وعشق ہی ہے۔ ان مثنویوں میں بہ طور عاشق شاعر کا کردار بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے میرؔ کی مثنویوں کو کچھ لوگوں نے ان کی آپ بیتی بھی کہا ہے۔ میرؔ نے اپنی مثنوی 'دریائے عشق' کو نثر میں بھی تحریر کیا تھا۔ مصحفیؔ نے میرؔ کی اسی مثنوی کو از سرنو 'بحرالمحبت' کے نام سے نظم کیا ہے۔ بعض محققین نے راسخؔ عظیم آبادی کی مثنویوں 'جذبِ عشق' اور 'کششِ عشق' میں میرتقی میرؔ کی اسی مثنوی 'دریائے عشق' کے اجزا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مثنویوں کا اگر بہ غور مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ کسی نے کسی کی مثنوی سے قصہ اخذ کیا تو کسی نے اپنی ذہانت وذکاوت کو بروئے کار لاکر اس قصے میں مزید رنگ شامل کرکے اسے وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ دراصل عشق کا موضوع اردو مثنوی نگاروں کو بہت راس آیا۔ اسی لیے شعرا نے اس موضوع کو مختلف طریقوں سے اپنی مثنویوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔

کلیات مومنؔ میں طویل ومختصر بارہ مثنویاں ہیں۔ ان مثنویوں میں بیش تر مثنویاں عشقیہ قصوں اور جذبات سے لبریز ہیں۔ شکایت ستم، قصہ غم، قول غمیں، تف آتشیں، حنین مغموم اور آہ وزاریٔ مظلوم؛ سب کی سب مثنویاں عشق وعاشقی کی داستان بیان کرتی ہیں۔ مومنؔ کی مثنویوں کو ڈاکٹر گیان چند نے 'معاملاتِ عشق کی عمدہ شرح' کہا

ہے۔ راسخ عظیم آبادی نے تقریباً ۷ امثنویاں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر کے موضوعات حسن وعشق سے وابستہ ہیں۔ داغ دہلوی کی مثنوی 'فریادِ داغ' نہایت دل چسپ اور حسن وعشق کی واردات کا خوب صورت بیانیہ ہے۔ صفیر بلگرامی کی مثنوی 'فتنۂ عشق'، تسلیم سہسوانی کی مثنوی 'سعدین'، مظہر لکھنوی کی مثنوی 'ریاضِ عشق'، عروج کی مثنوی 'عروجِ الفت' اور احسن لکھنوی کی مثنوی 'جذباتِ عشق' جیسی متعدد مثنویاں ہیں جن میں حسن وعشق کا بیان اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔

میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' پڑھیے تو عشقیہ قصے کی دل چسپیاں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ عشق ومحبت سے لبریز وہ قصے جو داستانوں میں موجود تھے، میر حسن کے ذوقِ سخن کے زیر اثر آئے تو 'سحر البیان' جیسا عظیم کارنامہ وجود میں آیا۔ بدر منیر اور بے نظیر کی بے مثال داستانِ عشق اس مثنوی کی پہچان بن گئی۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' بھی داستانِ عشق ومحبت ہی کا بیان ہے۔ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کے قصے کو دیا شنکر نسیم کی جادو بیانی نے شاہ کار بنادیا ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُردو کی بیش تر مثنویوں میں عشقیہ مضامین کی بہتات ہے۔ اسی لیے مثنوی کی ایک اہم قسم 'عشقیہ مثنوی' کہی جاسکتی ہے۔ یہاں چند اہم مثنویوں کا ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی مثنویاں ہیں جن کو عشقیہ مضامین کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔

رزمیہ مثنویاں: اُردو میں رزمیہ یا تاریخی وسوانحی مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دکن کے بہت سے شاعروں سے رزمیہ مثنویاں منسوب ضرور ہیں تاہم کوئی بھی مثنوی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سمیٹتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ شعرا کے دربار سے انسلاک کے سبب چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی ہوجاتی تھی یا بعض اوقات بادشاہِ وقت کی فرمائش پر کسی جنگ کے احوال رقم ہوجاتے تھے۔ اُردو میں رزمیہ موضوعات پر جو بھی مثنویاں ملتی ہیں، ان میں نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نصرتی کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑے احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ 'علی نامہ' کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی ہے جو شجاعت و بہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اسی لیے انھوں نے 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح وکامرانی کی سرشاری، شکست وریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی وسخاوت اور رعایا پروری سے متعلق واقعات کو بڑے ہی مستند طریقے اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی ہر لحاظ سے اُردو زبان کا ایک شاہ کار ہے۔ 'تاریخ اسکندری' بھی ان کی ایک اہم مثنوی ہے جو عہد سکندر عادل شاہ کی تاریخ ہے لیکن اس کا معیار وہ نہیں ہے جو 'علی نامہ' کا ہے۔

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

حفیظؔ جالندھری کا 'شاہ نامہٗ اسلام' اسلامی تاریخ پر مشتمل طویل مثنوی ہے۔ رستمی کی لکھی ہوئی مثنوی 'خاور نامہ' کو بھی رزمیہ مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عبدالغنی عبدلؔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کا شاعر ہے۔ اس کی مثنوی 'ابراہیم نامہ' میں ابراہیم عادل شاہ کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کسی بادشاہ کی سوانح عمری منظوم کی گئی ہے۔ حسن شوقیؔ کئی سلطنتوں سے وابستہ رہا۔ اس کی مثنوی 'فتح نامہ نظام شاہ' میں جنگ کے حالات تفصیل سے درج کیے گئے ہیں۔ 'فتح نامہ نظام شاہ' ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں دکن کے سلاطین اور وجیانگر کے حکمراں 'رام راج' کے درمیان ہونے والی ایک فیصلہ کن جنگ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ واجد علی شاہ کی مثنوی 'حزن اختر' کا شمار سوانحی اور تاریخی مثنویوں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں واجد علی شاہ نے اپنی معزولی اور قید و بند کی ساعتوں کو نظم کیا ہے۔ مشہور محقق گیان چند جین کے مطابق اس کی اہمیت ادبی سے زیادہ سوانحی اور تاریخی ہے۔ تاریخی مثنویوں میں امیر اللہ تسلیمؔ کی مثنوی 'تاریخ رام پور' بھی اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ اس مثنوی کے تین حصے ہیں؛ تواریخ بدیع، تواریخ کامل، سفر نامہٗ خسروی۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں رزمیہ، تاریخی اور سوانحی مثنویاں لکھی ضرور گئی ہیں لیکن ان میں 'علی نامہ' جیسا کوئی بڑا کارنامہ نظر نہیں آتا ہے۔

انجمنِ پنجاب کا قیام عمل میں آنے کے بعد مثنوی کے موضوعات میں تبدیلی آئی اور تنوع پیدا ہوا۔ حب الوطنی، وطن دوستی، موسم اور تیوہاروں کے موضوعات پر کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ خود مولانا محمد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے حب الوطنی کے موضوع پر اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔ دونوں نے 'حب وطن' کے نام سے مثنوی لکھی اور حب الوطنی کے تعلق سے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اسماعیل میرٹھی کی 'کوہ ہمالہ'، 'بارش کا پہلا قطرہ' اور 'حب وطن' جیسی مثنویوں میں وطن سے محبت کی سرشاری نظر آتی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی کی مثنوی 'مادرِ ہند' بھی اسی موضوع کی نمائندگی کرتی ہے۔ جاں نثارؔ اختر کی مثنوی 'امن نامہ' بھی وطن دوستی کے موضوع کو بیان کرتی ہے۔

جدید مثنویوں میں فطرت کو بھی خوب نظم کیا گیا ہے۔ حالیؔ کی 'برکھارُت' اس کی اہم مثال ہے جس میں گرمی کے موسم کا نقشہ نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسماعیلؔ میرٹھی نے بھی 'رات'، 'ہوا چلی' اور 'برسات' وغیرہ میں قدرت کے مناظر کو منظوم کیا ہے۔ اس عہد میں اقبال کی 'ساقی نامہ' جیسی مثنوی بھی لکھی گئی جس میں فلسفۂ خودی کی تشریح و تعبیر کی گئی ہے۔ جمیلؔ مظہری نے فکری و فلسفیانہ مثنویاں لکھ کر جدید مثنوی کو نیا رنگ دیا ہے۔ علی سردار جعفری اور کیفیؔ اعظمی جیسے ترقی پسند شعرا نے سیاسی رنگ میں ڈوبی مثنویاں تحریر کیں۔ اس کے ساتھ ہی سماجی، اخلاقی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات کو بھی جدید مثنویوں میں نمایاں طور پر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔

10.3.3 ماحصل

اُردو کی بیش تر ابتدائی مثنویاں مذہب وتصوف سے تعلق رکھتی ہیں۔اس لیے انھیں مذہبی یا متصوفانہ مثنویاں کہا جاتا ہے۔ایسی مثنویوں کو اخلاقی مثنویوں کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔ان مثنویوں کا موضوع تصوف، مذہبی تعلیمات اور انسانی و اخلاقی اقدار رہا ہے۔ مذہب وتصوف اُردو مثنوی کا موضوع ضرور رہا ہے لیکن اُردو مثنوی کو سب سے زیادہ عشقیہ موضوعات راس آئے۔اُردو کے بیش تر کلاسیکی شعرانے اُردو مثنویوں میں داستان عشق رقم کیا ہے۔میر تقی میرؔ سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالیؔ تک کی تمام اہم مثنویوں کا غالب موضوع عشق ہی ہے۔ غواصیؔ کی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' ابن نشاطیؔ کی 'پھول بن' ملا وجہیؔ کی 'قطب مشتری' یا دکن کے دیگر شعرا کی مثنویاں اٹھا کر دیکھیے تو اس میں عشق و عاشقی کی داستان اور الفت ومحبت کے جذبات سے پُر منظر نامے نظر آئیں گے۔شمالی ہند کے شعرانے بھی اس موضوع پر کثرت سے مثنویاں لکھی ہیں۔سوداؔ، میر سوزؔ، میر تقی میرؔ، قائمؔ چاند پوری، میر اثرؔ، مومنؔ، ذوقؔ، رنگینؔ، میر حسنؔ، دیا شنکر نسیمؔ اور مرزا شوقؔ لکھنوی وغیرہ کی مثنویاں عشقیہ بیانات و واقعات سے پُر ہیں۔اُردو میں رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔اُردو کی رزمیہ مثنویوں میں نصرتیؔ کی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ مذہب وتصوف، اخلاقی آداب و اقدار، حسن وعشق، رزم، تاریخ اور سوانح کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی مثنویاں تحریر کی گئی ہیں۔مثنوی کی ہیئت میں شکارنامے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ انجمنِ پنجاب کا قیام عمل میں آنے کے بعد مثنوی کے موضوعات میں تبدیلی آئی اور تنوع پیدا ہوا۔حب الوطنی، وطن دوستی، موسم اور تیوہاروں کے موضوعات پر متعدد مثنویاں لکھی گئی ہیں۔جدید مثنویوں میں مناظرِ فطرت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی سماجی، اخلاقی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات کو بھی جدید مثنویوں میں نمایاں طور پر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مثنوی کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کو سمجھا۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنوی نگاروں سے واقفیت حاصل کی۔
- مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات وامتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- جدید دور میں مثنوی کے موضوعات میں جو تبدیلی آئی، اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مثنوی کے موضوعات سے بحث کیجیے۔

۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مطابق مثنوی کی اقسام بتائیے۔

۳۔ اُردو کی ابتدائی مثنویوں پر اظہارِ خیال کیجیے۔

۴۔ اُردو میں زیادہ تر کن موضوعات پر مثنویاں لکھی گئیں؟

۵۔ اُردو میں رزمیہ مثنویوں کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

10.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مثنوی کے لیے موضوعات کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ شاعر جس موضوع پر چاہے، مثنوی لکھ سکتا ہے۔ بیانیہ حکایتیں، تصوف و اخلاقیات، عقائد و کلام، تفسیر و فقہ، ہجو و مدح، طنز و مزاح، سیاست و صحافت، مکتوب و آپ بیتی، علوم و فنون، ساقی نامہ، بارہ ماسہ، عشق و عاشقی کی داستان، پریوں، دیوزادوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے دل فریب قصے، رسم و رواج یہاں تک کہ نحو وصرف کی مثالیں اور بچوں کا ادب، ایسا کون سا موضوع ہے جسے مثنوی کی ہیئت میں نظم نہیں کیا گیا ہو۔ مذہبی واقعات، پند و نصائح، داستان حسن و محبت، میدان جنگ کی معرکہ خیزی، بزم طرب کی دل آویزی، رسوماتِ شادی و بیاہ، حیرت انگیز مافوق الفطری واقعات اور تاریخ کے علاوہ شہرِ آشوب، سبھی کچھ مثنویوں کا موضوع ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کے مضامین میں بڑی وسعت اور تنوع ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اُردو مثنوی کو عشقیہ موضوعات زیادہ راس آئے اور شعرائے اُردو نے اس موضوع پر بے مثال تخلیقات پیش کیں۔

۲۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مطابق مثنوی کی چھے قسمیں ہیں: (۱) مذہبی مثنویاں (۲) تاریخی مثنویاں (۳) معاشرتی کوائف و آثار سے متعلق مثنویاں (۴) فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں مثنویاں (۵) حب الوطنی سے متعلق مثنویاں (۶) ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں۔

۳۔ اُردو کی بیش تر ابتدائی مثنویاں مذہبی اور متصوفانہ ہیں۔ ان مثنویوں کا موضوع تصوف اور مذہبی تعلیمات واقدار رہا ہے۔ ابتدائی نمونوں کے تعلق سے عبدالسلام ندوی نے قطب شاہ کی ایک نعتیہ مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ محققین کی رائے ہے کہ مثنوی کے جو قدیم ترین نمونے ملتے ہیں، وہ بابا شیخ فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ بعض محققین نے حضرت امیر خسرؔو کے کلام کے بعض حصوں کو مثنوی کے اولین نمونے کے طور پر

پیش کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ بہاؤالدین برناوی اور سید ہاشم حسین علوی کے ملفوظات میں مثنوی کے ابتدائی نقوش کی نشان دہی کی ہے۔ ان تمام ابتدائی نمونوں کا نمایاں موضوع مذہب اور تصوف ہے۔

۴۔ اُردو میں زیادہ تر عشق ومحبت کے موضوعات پر مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ اُردو کے بیش تر کلاسیکی شعرا نے مثنویوں میں داستان عشق کو رقم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ادب نے عشقیہ داستان کو مثنوی کا بنیادی موضوع قرار دیا ہے۔ ان عشقیہ مثنویوں کو داستانوی مثنویوں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اُردو مثنویوں میں داستان طرازی کا انداز واسلوب مختلف ضرور رہا ہے لیکن چاہے طبع زاد مثنویاں ہوں یا پھر کسی دوسری زبان سے ترجمہ شدہ ہوں، ان سب کے قصوں کا مرکزی نکتہ عشق ہی رہا ہے۔

۵۔ اُردو میں رزمیہ یا تاریخی وسوانحی مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دکن کے بہت سے شاعروں سے رزمیہ مثنویاں منسوب ضرور ہیں تاہم کوئی بھی مثنوی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سمیٹی ہوئی نظر نہیں آتی۔ شعرا کے دربار سے انسلاک کے سبب چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی ہوجاتی تھی یا بعض اوقات بادشاہِ وقت کی فرمائش پر کسی جنگ کے احوال رقم ہوجاتے تھے۔ اُردو میں رزمیہ موضوعات پر جو بھی مثنویاں ملتی ہیں، ان میں نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نصرتی کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑے احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ 'علی نامہ' کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی ہے جو شجاعت وبہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اسی لیے انھوں نے 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح وکامرانی کی سرشاری، شکست وریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی وسخاوت اور رعایا پروری سے متعلق واقعات کو بڑے ہی مستند طریقے اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی ہر لحاظ سے اُردو زبان کا ایک شاہ کار ہے۔ اُردو کی دیگر رزمیہ مثنویوں میں نصرتی کی 'تاریخ اسکندری'، رستمی کی 'خاور نامہ'، عبدالغنی عبدل کی 'ابراہیم نامہ' اور حسن شوقی کی 'فتح نامہ نظام شاہ' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

10.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
طرب	:	خوشی، انبساط

مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)

شہر آشوب : آشوب کے لغوی معنی ہیں بربادی، بگاڑ یا فتنہ وفساد، شاعری کی اصطلاح میں شہر آشوب ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی پریشانی، گردشِ آسمانی اور زمانے کی ناقدری کا بیان ہو

بارہ ماسہ : وہ نظم جس میں بیوی اپنے شوہر کی جدائی میں ہر مہینے اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کا اظہار کرتی ہے

رزمیہ : وہ داستان جس میں جنگ کے حالات وواقعات قلم بند کیے گئے ہوں

شکارنامہ : وہ منظوم یا منثور تحریر جس میں شکار کی کسی مہم کے حالات رقم کیے جائیں

اسرار : بھید، راز

مربوط : منسلک، جڑا ہوا

متنوع : گوناگوں، قسم قسم کا

تفویض : سپردگی، حوالگی، تحویل

مکارم : خوبیاں، اچھائیاں

رموز : ایما، اشارہ

معراج : بلندی، اعلیٰ درجہ

مظہر : ظاہر، ظاہر ہونے کی جگہ

آب وتاب : چمک دمک، آرائش، زیبائش

تخصیص : خصوصیت، خاص کرنا

تعبیر : تشریح، توضیح

لبریز : بھرا ہوا، پُر، لبالب

معرکہ خیز : ہنگامہ برپا کرنے والا، دھوم مچانے والا، زبردست

10.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں : پروفیسر گیان چند جین

۲۔ مثنوی نگاری : علی جواد زیدی

۳۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

۴۔	اُردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)	:	سید محمد عقیل رضوی
۵۔	جدید اُردو مثنوی: فن اور فکری ابعاد	:	ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 11 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد
11.2 تمہید
11.3 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا
11.3.1 مثنوی کا پس منظر
11.3.2 بہمنی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا
11.3.3 عادل شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا
11.3.4 قطب شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا
11.3.5 ماحصل
11.4 آپ نے کیا سیکھا؟
11.5 اپنا امتحان خود لیجیے
11.6 سوالوں کے جوابات
11.7 فرہنگ
11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- مثنوی کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- بہمنی دور میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے آگاہ ہوں گے۔
- عادل شاہی دور میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے بحث کریں گے۔
- قطب شاہی دور میں اُردو مثنوی کے ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- دکنی اُردو مثنویوں کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔

11.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزاے ترکیبی، فنی خصوصیات اور اس کی اقسام سے واقف ہوئے۔ اب اس اکائی میں آپ مثنوی کے پس منظر، دکن میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے واقف ہوں گے اور دکنی اُردو مثنویوں کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔

11.3 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

11.3.1 مثنوی کا پس منظر

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عربی شاعری میں اس صنف کا رواج نہیں رہا ہے۔ عربوں میں 'رجز' نام کی شعری صنف ضرور تھی جسے بعض علماے ادب نے مثنوی سے مشابہ قرار دیا ہے۔ 'مثنوی' کا نام اہلِ ایران کا ایجاد کردہ ہے۔ اہلِ عرب نے اسے 'مزدوجہ' کا نام دیا ہے۔ صنفِ مثنوی کی موجودہ شکل نے ایران میں جنم لیا۔ فارسی زبان سے یہ صنف اُردو میں آئی۔ اُردو والوں نے اس کا نام اسی طرح برقرار رکھا لیکن اُردو کے شاعروں نے اپنی ہنرمندی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے بل پر اسے اُردو کی اپنی چیز بنا ڈالا۔ مثنوی نگاری میں اولیت کی بحث سے قطع نظر، اس بات پر تقریباً سبھی ناقدین ادب کا اتفاق ہے کہ فردوسیؔ کا 'شاہنامہ' پہلی مکمل مثنوی ہے۔ اسے دقیقیؔ نے شروع کیا اور فردوسیؔ نے تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اس لیے اگر چہ رودکیؔ کو پہلا مثنوی نگار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن مثنوی نگاری کے باضابطہ آغاز کا سہرا فردوسیؔ کے 'شاہنامہ' کے سر جاتا ہے۔ اُردو میں مثنوی کے جو قدیم ترین نمونے دستیاب ہیں، وہ حضرت بابا فرید گنج شکر اور دیگر صوفیاے کرام سے منسوب ہیں۔ اس ضمن میں قطبنؔ، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانمؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو مثنوی کے فروغ میں دکن کا اہم کردار رہا ہے اور دکن میں اس کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔

11.3.2 بہمنی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

مثنوی اُردو شاعری کی قدیم اور مقبول صنف ہے جسے مشہور محقق گیان چند جین نے اُردو میں بیانیہ شاعری کی معراج قرار دیا ہے۔ فارسی شاعری سے اُردو میں آنے والی اس صنف نے خوب خوب ترقی کی۔ اُردو کے متعدد شعرا نے صنفِ مثنوی میں خوب طبع آزمائی کی اور اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی اُردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ مثنویوں کے تذکرے کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اُردو میں قصہ گوئی اور اسالیب کے ارتقائی سفر کا جائزہ مثنوی کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ابتدائی زمانے میں غزل کے بعد شعرا نے مثنوی میں سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں داستانِ حیات بیان کرنے کے بہت سے امکانات موجود ہیں۔ شاعر انسانی سماج و معاشرے کی تمام تر صورت حال کی عکاسی اس فن میں بہ آسانی کرسکتا ہے۔ شاعر انسانی زندگی اور اس کی تہذیب وثقافت کی داستان کو جس خوبی سے اس میں پیش کرسکتا ہے، کسی اور صنف سخن میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصنافِ شاعری میں مثنوی کو بے پناہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ مثنویوں کے ذریعے اس دور کے ادبا و شعرا کی ذہنی و جذباتی کیفیات اور سماجی صورت حال کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس صنف کی اہمیت وافادیت،

مقبولیت اور وسعتِ موضوع و بیان کی وجہ سے اُردو کے تقریباً بیش تر کلاسیکی غزل گو شعرا نے مثنویاں لکھی ہیں۔ دکن کے شعرا نے بھی اس صنف میں اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کے زیادہ تر شعرا کی شناخت میں ان کی مثنویوں کا بڑا حصہ ہے۔

دکن میں اُردو مثنوی کی روایت کو بہ آسانی سمجھنے کے لیے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ بہمنی دور، عادل شاہی دور، قطب شاہی دور۔ مشہور محققین پروفیسر عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ کے مطابق اُردو مثنوی کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں رقم طراز ہیں:

> ''جہاں تک تحقیق کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی ہے۔''
>
> (نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اُردو، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص:۴۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فخر دین نظامی کی مثنوی کو اُردو کی پہلی مثنوی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اُردو زبان کی پہلی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے جس کے مصنف فخر دین نظامی ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اُردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص:۴۰۰)

نظامی بیدری کا تعلق بہمنی دور سے ہے۔ دکن میں بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۷ء تک قائم رہی۔ ابتدا میں اس سلطنت کا پایۂ تخت گلبرگہ رہا اور بعد میں اسے بیدر منتقل کر دیا گیا۔ بہمنی سلطنت کے بیش تر حکمرانوں نے شعرو ادب کی تخلیق اور اس کے فروغ کے لیے انتہائی سازگار ماحول فراہم کیا۔ بہمنی دور کے معاشرتی اور تہذیبی ماحول میں فنون لطیفہ خصوصاً شعروادب کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ اُردو کی پہلی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اسی عہد کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق بہمنی دور کے نویں حکمراں شہاب الدین احمد شاہ ولی بہمنی کے دور میں نظامی بیدری نے یہ مثنوی لکھی تھی۔ نصیرالدین ہاشمی نے نظامی بیدری سے متعلق لکھا ہے کہ وہ 'سلطان کا درباری شاعر' تھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نظامی بیدری کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''موجودہ معلومات کے لحاظ سے (نظامی) اُردو کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے حسن و عاشقی کے موضوع پر ایک طویل مثنوی 'پدم راؤ' لکھی، ورنہ اس سے قبل جو اُردو نظم و نثر ملتی ہے، وہ بالعموم مذہبی اور صوفیانہ موضوعوں سے متعلق ہے۔''

(ڈاکٹر محی الدین قادری زور (مرتبہ)، دکنی ادب کی تاریخ، اُردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص:۱۴)

مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں جو قصہ بیان ہوا ہے، وہ مقامی روایات و اعتقادات سے وابستہ ہے۔اس کا قصہ کدم راؤ اور پدم راؤ دو کرداروں پر مشتمل ہے۔کدم راؤ راجا ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر جو کہ ایک ناگ ہے۔اس کے سلسلے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اس کا مرکزی تصور ہندی دیومالائی ادب سے متاثر ہے۔اس مثنوی میں سنسکرت دیومالا کی چھاپ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے کئی عقائد کا بیان ملتا ہے۔بادشاہ کا وزیر ایک ناگ کا ہونا، کستوری اور مشک یا صندل پیشانی پر لگانا، جوگیوں سے علم حاصل کرنا یا پھر تبدیلیِ قالب کا تصور اسی تہذیبی روایت کا حصہ ہے جو ہندوستان کی مٹی میں صدیوں سے رائج رہی ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے مشہور صوفی گزرے ہیں۔ان کی کتابوں میں اسرار و معرفت کو خاص جگہ دی گئی ہے۔ان کی تخلیقات میں صوفیانہ خیالات ہندوستانی قالب میں ڈھال کر پیش کیے گئے ہیں۔ان کی تصنیف 'خوش نامہ' مثنوی کی ہیئت میں ہے۔اسے ابتدائی دور کی مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے جس میں مذہبی و متصوفانہ موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔یہ مثنوی ۱۱۷۰ اشعار پر مشتمل ہے۔'خوش نغز' اور 'شہادۃ الحقیقت' نامی مثنویاں بھی انھیں سے منسوب ہیں۔ان مثنویوں میں بھی تصوف، عرفان روح، عرفان ذات، عقل و عشق، شریعت و طریقت اور دین کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔

اشرؔف بیابانی کو بہمنی دور کے شعرا میں نمایاں مقام حاصل ہے۔'نوسر ہار' اور 'واحد باری' ان سے منسوب مشہور مثنویاں ہیں۔ان مثنویوں کا موضوع مذہب ہے۔ان کی ایک مثنوی کا نام 'لازم المبتدی' ہے جس میں مرد اور عورت سے متعلق شرعی احکامات بیان کیے گئے ہیں۔مثنوی 'واحد باری' امیر خسرو کی 'خالق باری' کے طرز پر لکھی گئی تخلیق ہے۔'نوسر ہار' ان کی سب سے اہم مثنوی ہے جس میں واقعات کربلا کو پیش کیا گیا ہے۔اس میں تقریباً اٹھارہ سو اشعار ہیں۔دکن کی مثنویوں میں 'نوسر ہار' کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مذہب اور عشق کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔اس مثنوی میں رزمیہ عناصر بھی موجود ہیں۔

بہمنی دور میں اُردو شعر و ادب کو فروغ دینے والوں میں بہت سے صوفیا اور شعرا کے نام ملتے ہیں۔مشتاؔق، لطفؔی، اشرؔف، نظاؔمی اور سید محمد حسینؔی گیسو دراز وغیرہ کو اس عہد کے نمائندہ شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔البتہ مثنوی کے حوالے سے نظاؔمی بیدری، میراں جی شمس العشاؔق اور اشرؔف بیابانی کا نام قابلِ ذکر ہے۔بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں؛ عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی قائم ہوئیں۔ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں اُردو شعر و ادب بالخصوص مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

11.3.3 عادل شاہی دور میں اُردو مثنوی کا ارتقا

عادل شاہی سلطنت کا قیام ۱۴۹۰ء میں عمل میں آیا۔بہمنی دور کے مشہور وزیر محمود گاواں کے قتل کے بعد ان کے

تربیت یافتہ سلطان یوسف عادل شاہ نے بہمنی سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بیجاپور کے علاقے میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے عادل شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔ تقریباً دو صدی تک یہ حکومت قائم رہی۔ اس عہد میں علم و ادب، شعر و شاعری، خصوصاً صنفِ مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے مشہور مثنوی نگاروں میں عبدلؔ، برہان الدین جانمؔ، مقیمیؔ، حسن شوقیؔ، علی عادل شاہ ثانی، نصرتیؔ، ہاشمیؔ، رستمیؔ اور ملک خوشنودؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

عادل شاہی عہد کے ایک اہم شاعر عبدالغنی عبدلؔ ہیں جنھوں نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مدح میں 'ابراہیم نامہ' کے نام سے تاریخی مثنوی تحریر کی۔ اس میں بادشاہِ وقت کی سوانح اور عہد و معاشرت کو پیش کیا گیا ہے۔ عبدلؔ نے اس مثنوی میں بادشاہ وقت، ان کے شہر، ان کے دربار، محل، شوق و شکار، لشکر، باغ اور میزبانی کی تعریف میں ابواب قائم کیے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے اسے مثنوی کی ہیئت میں طویل قصیدہ قرار دیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مثنوی کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کسی بادشاہ کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔ ناقدین ادب نے اس کی تاریخی اہمیت اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے عبدلؔ کی دل چسپی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے دکنی زبان کی تشکیل میں اہم قرار دیا ہے۔

میراں جی کے فرزند برہان الدین جانمؔ عادل شاہی دور کے اہم صوفی بزرگ تھے۔ ان کی تحریروں میں تصوف و سلوک، رشد و ہدایت اور پند و نصیحت جیسے نکات ملتے ہیں۔ 'ارشاد نامہ'، 'حجت البقا'، 'وصیت الہادی'، 'بشارت الذکر' اور 'منفعت الایمان' وغیرہ مثنویاں انھیں کے نام سے منسوب ہیں۔ 'ارشاد نامہ' ان کی طویل مثنوی ہے جس میں تصوف کے نکات پیش کیے گئے ہیں۔ جانمؔ کی مثنویوں کا موضوع اگرچہ تصوف ہے مگر ان کے یہاں مقامی عناصر و اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں شیو جی سے عقیدت بھی ہے اور کرشن جی کے عشق میں تڑپتی گوپیوں کا بیان بھی ہے۔

مقیمیؔ کا شمار عادل شاہی عہد کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی مثنوی 'چندر بدن و مہیار' اُردو کی اہم مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس مثنوی کا ماخذ شہر سندر پٹن کی شہزادی چندر بدن سے متعلق ایک معروف قصہ ہے۔ چندر بدن خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ ایک میلے میں مہیار نامی ایک مسلمان سوداگر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ان ہی دونوں کے عشق کی داستان کو مقیمیؔ نے اپنی اس مثنوی میں نظم کیا ہے۔ اس مثنوی میں مافوق الفطرت واقعات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مقیمیؔ کی ایک مثنوی 'فتح نامہ' بھی ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں سلطان محمد عادل شاہ اور راجا ایربھدر کے درمیان ہوئی جنگ کی کہانی پیش کی گئی ہے۔

عادل شاہی عہد کے شعرا میں ایک اہم نام حسن شوقیؔ کا ہے۔ وہ کئی سلطنتوں سے وابستہ رہے۔ ان کی مثنوی 'فتح نامۂ نظام شاہ' اور 'میزبانی نامہ' کا شمار اُردو کی مشہور رزمیہ اور سوانحی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ 'فتح نامۂ نظام شاہ' میں دکن کے سلاطین اور وجیانگر کے حکمراں 'آلیہ رام رائے' کے درمیان ہونے والی ایک فیصلہ کن جنگ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس مثنوی کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ اس میں مستند واقعات کے ساتھ ساتھ اس وقت کی تہذیب و معاشرت کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی صرف سلطان ہی نہیں، بلکہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے جن کی توجہ اور محنت سے بیجا پور کی فضا میں شعر و شاعری کا خوب رنگ جما۔ علی عادل شاہ ثانی نے دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی کہیں۔ ان کے کلیات میں تین مثنویاں ملتی ہیں۔ پہلی مثنوی کا تعلق حضرت علیؓ کے فتح خیبر کے واقعے سے ہے جس کا نام 'خیبر نامہ' ہے۔ یہ ایک مختصر مثنوی ہے جس میں ۲۷ اشعار ہیں۔ مرتب کلیات شاہیؔ نے لکھا ہے کہ روانی، سلاست اور خوش اعتقادی کے سوا اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں۔ شاہیؔ کی باقی دو مثنویوں میں صرف سات سات اشعار ہیں۔ ان دونوں مثنویوں میں سنسکرت شعریات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ پہلی مثنوی میں محبوبہ کے سراپا کی آسمان، رات، چاند اور چکر بان وغیرہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا نام 'دکھائی گگن کا تماشا لگار' ہے۔ جب کہ دوسری مثنوی میں ایک ایسی محبوبہ کی تصویر پیش کی گئی ہے جو سر تا پیر سونے کے زیورات سے آراستہ کی گئی ہے۔ شاہیؔ نے اس کے اعضا و جوارح اور ناز و ادا کی مرقع کشی کی ہے۔ اس مثنوی کا نام 'ایک محبوبہ' ہے۔

عادل شاہی دور میں نصرتیؔ کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ بادشاہ کے دربار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ 'گلشن عشق' ان کی انتہائی مشہور مثنوی ہے جس کا شمار اُردو کی چند بڑی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس مثنوی کے مرکزی قصے کی بنیاد قدیم لوک کہانی پر ہے۔ اس میں کنور منوہر اور مدھ مالتی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے جو قدیم زبانی بیانیہ کا حصہ رہی ہے۔ فارسی میں بھی اس قصے کو کئی شاعروں نے نظم کیا ہے۔ ناقدین فن و ادب نے اس مثنوی کی فنی و ادبی خوبیوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس مثنوی کا ہندوستانی رنگ و آہنگ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ نصرتیؔ کی دوسری اہم ترین مثنوی 'علی نامہ' ہے۔ اُردو کی رزمیہ مثنویوں میں 'علی نامہ' سر فہرست ہے۔ اس مثنوی میں بیجا پور پر مغلوں اور شیوا جی کی قیادت والے مرہٹوں کی رسہ کشی کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجا پور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ 'تاریخ اسکندری' بھی ان کی ایک اہم مثنوی ہے جو عہد سکندر عادل شاہ کی تاریخ ہے۔ یہ نصرتیؔ کے اس دور کا کلام ہے جب بیجا پور کی سلطنت انحطاط کا شکار تھی۔ سکندر عادل شاہ کی فوجی مہمات کے احوال اس مثنوی کا حصہ ہیں۔ ہاشمیؔ کی مثنوی 'یوسف زلیخا' بھی عادل شاہی دور کی یادگار ہے۔ ہاشمیؔ کی یہ مثنوی پانچ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے جس کو غیر معمولی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ محققین نے یوسف زلیخا کے موضوع پر لکھی گئی مثنویوں میں فنی خوبیوں کی بنیاد پر اس مثنوی کو بہت اہمیت دی ہے۔ کمال خاں رستمیؔ عادل شاہی دور کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے ایک طویل مثنوی 'خاور نامہ' تحریر کی ہے۔ اسے رزمیہ مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے۔ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل یہ ایک اہم رزمیہ مثنوی ہے جس میں حضرت علی کی جنگوں کے تذکرے ہیں لیکن اس میں بیان کردہ واقعات کا کوئی تاریخی استناد نہیں ہے بلکہ سبھی قصے فرضی اور من گھڑت ہیں۔ اسے بعض محققین نے دکن کی بہترین مثنوی قرار دیا ہے۔ ترجمہ ہونے کے باوجود بھی قصوں کا ربط و تسلسل کمال کا ہے۔

ملک خوشنودؔ بنیادی طور پر گول کنڈہ کے باشندہ تھے اور عبداللہ قطب شاہ کی بیٹی خدیجہ کے جہیز میں بہ حیثیت غلام

بیجاپور آئے تھے۔ان کی شاعرانہ صلاحیتیں کمال کی تھیں جن کے سبب وہ جلد ہی عادل شاہی سلطنت کے نمائندہ شعرا میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔انھوں نے دو مثنویاں؛'یوسف زلیخا' اور 'جنت سنگار' تحریر کیں۔مثنوی 'جنت سنگار' میں بہرام اور گور کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔یہ مثنوی امیر خسرو کی مثنوی 'ہشت بہشت' کا ترجمہ ہے۔عادل شاہی عہد میں ان کے علاوہ بھی کئی اہم مثنویاں لکھی گئیں۔اسی عہد میں امینؔ نامی شاعر گزرے ہیں جن کی مثنوی 'بہرام وحسن بانو' کافی مشہور ہے جس میں عشقیہ قصے کو بیان کیا گیا ہے۔امینؔ نے ہندوستانی اساطیر وروایات کا اثر قبول کرتے ہوئے بہرام کو ایسے کردار کے رُوپ میں پیش کیا ہے جس میں کرشن جی کی جھلک نظر آتی ہے۔محمد ابراہیم خان صنعتیؔ بھی بیجاپور کے نام ور شاعر ہیں۔'قصۂ بے نظیر یا قصۂ تمیم انصاری' اور 'گلدستہ' ان کی دو اہم مثنویاں ہیں جن میں حضرت تمیم انصاری اور نبی کریم ﷺ سے متعلق واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔مختارؔ عادل شاہی دور کے شاعر ہیں جنھوں نے تین ہزار اشعار پر مشتمل 'معراج نامہ' تحریر کیا ہے۔اس مثنوی میں نبیؐ کے واقعۂ معراج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ان کی ایک اور مثنوی 'نور نامہ' بھی مذہبی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ایاغیؔ کی مثنوی 'نجات نامہ' میں دین اسلام کے فرائض واحکام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔یہ وہ مشہور مثنوی نگار ہیں جن کا تعلق عادل شاہی عہد سے ہے۔ان کے علاوہ بھی کئی دیگر شعرا ہیں جنھوں نے عادل شاہی عہد میں شعر وادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

11.3.4 قطب شاہی دور میں اردو مثنوی کا ارتقا

قطب شاہی سلطنت کی بنیاد سلطان قلی قطب الملک نے ۱۵۱۲ء میں رکھی اور تقریباً ۱۶۸۷ء تک یہ سلطنت قائم رہی۔اورنگ زیب نے ۱۶۸۷ء میں اسے فتح کرکے وہاں مغل حکومت قائم کی۔قطب شاہی سلطنت کے بادشاہوں کو علم وادب سے خاص لگاؤ تھا۔وہ ہنر مندوں اور تخلیقی صلاحیت کے مالک ادبا وشعرا کی سرپرستی اور قدر کرتے تھے۔اسی لیے قطب شاہی دورِ حکومت میں مختلف علوم وفنون نے خوب ترقی کی۔قطب شاہی عہد میں شعر وشاعری بالخصوص اُردو مثنوی نے نئی اونچائیاں حاصل کیں۔ملا وجہیؔ، ابن نشاطیؔ، غواصیؔ اور بحریؔ وغیرہ اس عہد کے نمائندہ مثنوی نگار ہیں۔

قطب شاہی عہد میں بہ طور مثنوی نگار سب سے پہلا نام شیخ احمد شریف گجراتی کا آتا ہے۔انھیں محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دربار میں انتہائی عزت واکرام سے نوازا تھا۔حیدرآباد کے قیام کے دوران ہی شیخ احمد شریف گجراتی نے مشہور رومانوی داستان 'قصہ یوسف زلیخا' کو مثنوی کی شکل میں پیش کیا تھا۔یہ مثنوی دراصل مولانا جامی کی فارسی مثنوی 'یوسف زلیخا' کا دکنی ترجمہ ہے۔احمد گجراتی نے قلی قطب شاہ کی فرمائش پر ایک اور مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' لکھی جس میں لیلیٰ مجنوں کے روایتی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔قطب شاہی عہد کے دوسرے اہم ترین مثنوی نگار کا نام ملا اسداللہ وجہیؔ ہے۔ان کا تعلق قلی قطب شاہ کے دربار سے تھا۔انھوں نے ۱۶۰۹ء میں ایک مثنوی 'قطب مشتری' تحریر کی جس میں محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستانِ محبت کے فرضی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔اس مثنوی کا مرکزی کردار قلی قطب شاہ ہے۔یہ مثنوی کئی اعتبار سے اُردو کی چند بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی

ہے۔اس مثنوی میں منظر نگاری اور سراپا نگاری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔اس میں قطب شاہی عہد کی تصویریں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔غواصؔی کا شمار قطب شاہی عہد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی تین مثنویاں 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال' اور 'طوطی نامہ' اُردو شعر و ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔غواصؔی کی مثنوی 'میناستونتی' معروف بہ 'چندا اور لورک' قدیم قصے سے ماخوذ ہے۔اس کی بنیاد ایک لوک کہانی پر ہے جس میں مینا نامی عورت کے باعصمت رہنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔اس قصے کو کئی شعرا نے نظم کیا ہے تاہم غواصؔی کے قصے کی بنیاد فارسی قصے پر ہے۔غواصؔی کی اس پوری مثنوی میں ہندی لوک کتھاؤں کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ان کی مثنوی 'طوطی نامہ' میں جو قصہ بیان ہوا ہے، اس کے تعلق سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ 'طوطی نامہ' میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں، ان کا تعلق ایک سنسکرت کتاب 'شک سپ تتی' سے ہے جس کے معنی ہیں توتے کی زبانی بیان کردہ ستّر (۷۰) کہانیاں۔اس مثنوی میں غواصؔی نے اپنے تخیل کا سہارا لے کر قصے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔اس مثنوی کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

> ''غواصؔی نے 'طوطی نامہ' کا بنیادی قصہ نخشبی سے لیا ہے لیکن اس میں کہیں کہیں حسب ضرورت تصرفات بھی کر دیے ہیں۔خصوصاً مثنوی کا ابتدائی اور آخری حصہ غواصؔی کے زورِ تخیل کا پتا دیتا ہے۔نخشبی نے سنسکرت کی ستّر کہانیوں میں سے صرف ۵۲ کو فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔...غواصؔی نے نخشبی کی ان باون کہانیوں میں سے فقط ۴۵ کو اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص: ۸۴)

غواصؔی کی اہم ترین مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' ایک عشقیہ مثنوی ہے اور الف لیلہ کی نثری داستان سے ماخوذ ہے۔یہ غواصؔی کی شاہ کار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔اس مثنوی میں محبوب کی تلاش کا سفر انتہائی دل چسپ ہے۔اس سفر میں مافوق الفطرت مظاہر و مناظر کی بہتات ہے۔قطب شاہی دور کے مثنوی نگاروں میں ابن نشاطؔی کا نام بے حد اہم ہے۔ان کی مثنوی 'پھول بن' اُردو کی چند نمایاں مثنویوں میں سے ایک ہے۔'پھول بن' احمد حسن دبیر کی ایک فارسی مثنوی 'بساتین الانس' سے ماخوذ ہے جس کا ذکر مثنوی نگار نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔اس قصے میں الف لیلیٰ کی کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی قصوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔اس کے کردار مصری اور ایرانی ہیں لیکن ان کی خصلتیں ہندوستانی ہیں۔شکل و صورت سے لے کر ان کے طرزِ زندگی پر ہندوستانی چھاپ نمایاں ہے۔قطب شاہی عہد میں ایک شاعر قاضی محمود بحرؔی بھی گزرے ہیں۔ان کی مثنویاں 'من لگن' اور 'بنگاب نامہ' مشہور ہیں۔'من لگن' میں تصوف کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔اس مثنوی کی زبان و بیان دل کش ہے۔ان کی دوسری مثنوی 'بنگاب نامہ' تہذیبی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔بنگاب سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی بھنگ کے ہیں جس سے مراد شیو جی کو قوت فراہم کرنے والی بوٹی ہے۔اس مثنوی میں بحرؔی نے

بھنگ کے نشے میں خود کو خدا کے ساتھ ملا دینے کی بات کہی ہے۔ ہندو عقیدے میں بھگوان شیو کا معاملہ ایسا ہی ہے کہ وہ بھنگ کا سیون کرتے ہیں کیوں کہ ان کے مطابق اس کے نشے میں انھیں پر ماتما کی قربت حاصل ہوتی ہے۔ قطب شاہی عہد کی دیگر مثنویوں میں جنیدؔی کی مثنوی 'ماہ پیکر' اور طبعؔی کی مثنوی 'بہرام و گل اندام' بھی قابلِ ذکر ہیں۔

قطب شاہی عہد کے خاتمے کے بعد دکن میں مغلیہ دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی چند اہم مثنویاں لکھی گئیں جن میں سے بیش تر مذہبی موضوعات پر ہیں۔ عزلتؔ کی صوفیانہ مثنوی 'روضۃ الشہدا'، وجدیؔ کی مثنوی 'پنچھی باچھا'، محمد علی حاجزؔ کی مثنوی قصہ 'ملکۂ مصر' حسن ذوقیؔ کی مثنوی 'وصال العاشقین' اور مجرمیؔ کی مثنوی 'گلشنِ حسنِ دل' اسی عہد کی یادگار ہیں۔ دکن میں مغلیہ عہد کے دو اہم شاعروں میں ولیؔ اور سراجؔ اورنگ آبادی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ولیؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ البتہ انھوں نے چند مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک مختصر مثنوی 'در مدحِ سورت' ہے۔ ولیؔ کے بالمقابل سراجؔ نے مثنوی نگاری کے میدان میں جم کر اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی چند اہم مثنویوں میں 'بوستانِ خیال'، 'سوز و گداز'، 'نالۂ ہجر'، 'احوالِ فراق'، 'خط بندگی' اور 'مطلبِ دل' قابلِ ذکر ہیں۔ 'بوستانِ خیال' اور 'سوز و گداز' زیادہ مشہور مثنویاں ہیں۔ 'بوستانِ خیال' میں سراجؔ نے اپنی زندگی کے احوال قلم بند کیے ہیں۔ خصوصاً وارداتِ عشق کو انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ گیارہ سو ساٹھ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی انھوں نے محض دو دن میں لکھی ہے۔ اس سے فنِ مثنوی نگاری کی باریکیوں اور لوازمات سے ان کی آگہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس مثنوی کی خوبی اس کے بیان کی سادگی ہے۔ اس میں واقعات کی پے چیدگی اور مشکل تراکیب والفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اپنے مخصوص انداز و اسلوب کے سبب یہ مثنوی انفرادی شناخت رکھتی ہے۔ ولیؔ اور سراجؔ کے بعد دکن میں اُردو مثنوی کا فروغ اس طرح نہیں ہوا لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بہمنی عہد میں اُردو مثنوی نگاری کا جو سفر دکن میں شروع ہوا تھا، اس نے عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں اس قدر ترقی کی منزلیں طے کیں کہ اُردو کی کئی بہترین مثنویاں منظرِ عام پر آئیں جو اُردو شعر و ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اس طرح دکن میں اُردو مثنوی نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔

11.3.5 ماحصل

دکن میں اُردو مثنوی نگاری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دکن میں اُردو مثنوی کی ایک توانا روایت رہی ہے۔ اس کا باضابطہ آغاز بہمنی دور میں ہوا۔ فخر دین نظامیؔ بیدری کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اُردو کی پہلی مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ بہمنی دور کی دوسری مثنویوں میں میراں جی شمس العشاق کی 'خوش نامہ'، 'خوش نغز' اور 'شہادۃ الحقیقت' اور اشرف بیابانیؔ کی 'واحد باری'، 'لازم المبتدی' اور 'نوسرہار' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بہمنی عہد کے بعد بیجاپور کی عادل شاہی اور گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنتوں کے زیرِ اثر اُردو مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ عادل شاہی عہد میں عبدلؔ کی 'ابراہیم نامہ'، برہان الدین جانمؔ کی 'ارشاد نامہ'، 'وصیت الہادی'، 'منفعت الایمان' مقیمیؔ کی 'چندر بدن ومہیار'، 'فتح نامہ' حسن شوقیؔ کی 'فتح نامہ نظام شاہ'، 'میزبانی نامہ' نصرتیؔ کی

'گلشن عشق'، 'علی نامہ'، 'تاریخِ سکندری' سید میراں ہاشمی کی 'یوسف زلیخا'، 'معراج نامہ' ملک خوشنود کی 'یوسف زلیخا'، 'جنت سنگار' اور رستمی کی 'خاور نامہ' جیسی اہم ترین مثنویوں نے دکن میں اُردو مثنوی کی روایت کو مستحکم کیا۔ قطب شاہی عہد میں بھی کئی اہم مثنویاں لکھی گئیں جن میں احمد گجراتی کی 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں' ملا وجہی کی 'قطب مشتری' ابن نشاطی کی 'پھول بن' غواصی کی 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال'، 'طوطی نامہ' جنیدی کی 'ماہ پیکر' اور طبعی کی 'بہرام وگل اندام' کا شمار اُردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ دکن میں مغلیہ عہد میں بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ عزلت کی 'روضۃ الشہدا' بحری کی 'من لگن' حسین ذوقی کی 'وصال العاشقین' مجرمی کی 'گلشنِ حسنِ دل' ولی کی 'در مدح سورت' اور سراج کی 'بوستانِ خیال' وغیرہ اسی عہد کی یادگار مثنویاں ہیں۔ اس طرح دکن میں اُردو مثنوی نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- مثنوی کے پس منظر سے واقفیت حاصل کی۔
- بہمنی دور میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے آگہی حاصل کی۔
- عادل شاہی دور میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے بحث کی۔
- قطب شاہی دور میں اُردو مثنوی کے ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- دکنی اُردو مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھا۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مثنوی کے پس منظر سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

۲۔ بہمنی دور کی تین اہم مثنویوں کے نام مع مصنف تحریر کیجیے۔

۳۔ عادل شاہی عہد کے اہم مثنوی نگاروں اور ان کی مثنویوں کے نام بتائیے۔

۴۔ قطب شاہی عہد کی اہم مثنویاں کون کون سی ہیں؟

۵۔ دکن میں مغلیہ عہد میں لکھی گئی چند قابلِ ذکر مثنویوں کے نام لکھیے۔

11.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عربی شاعری میں اس صنف کا رواج نہیں رہا ہے۔ عربوں میں 'رجز' نام کی شعری صنف ضرور تھی جسے بعض علمائے ادب نے مثنوی سے مشابہ قرار دیا ہے۔ 'مثنوی' کا نام اہلِ ایران کا ایجاد کردہ ہے۔ اہلِ عرب نے اسے 'مزدوجہ' کا نام دیا ہے۔ صنفِ مثنوی کی موجودہ شکل نے ایران میں جنم لیا۔ فارسی زبان سے یہ صنف اُردو میں آئی۔

۲۔ بہمنی دور کی تین اہم مثنویوں میں ’کدم راؤ پدم راؤ‘، ’خوش نامہ‘ اور ’نوسر ہار‘ قابلِ ذکر ہیں۔ ’کدم راؤ پدم راؤ‘ کے مصنف فخر دین نظامیؔ ’خوش نامہ‘ کے مصنف میراں جی شمس العشاق اور ’نوسر ہار‘ کے مصنف اشرف بیابانیؔ ہیں۔

۳۔ عادل شاہی عہد کے اہم مثنوی نگاروں میں عبدلؔ، برہان الدین جانمؔ، مقیمیؔ، حسن شوقیؔ، نصرتیؔ، سید میراں ہاشمیؔ، ملک خوشنودؔ اور رستمیؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ عبدلؔ کی مثنوی ’ابراہیم نامہ‘ برہان الدین جانمؔ کی مثنویاں ’ارشاد نامہ‘، ’وصیت الہادی‘، ’منفعت الایمان‘ مقیمیؔ کی مثنویاں ’چندر بدن و مہیار‘، ’فتح نامہ‘ حسن شوقیؔ کی مثنویاں ’فتح نامہ نظام شاہ‘، ’میزبانی نامہ‘ نصرتیؔ کی مثنویاں ’گلشن عشق‘، ’علی نامہ‘، ’تاریخِ سکندری‘ سید میراں ہاشمیؔ کی مثنویاں ’یوسف زلیخا‘، ’معراج نامہ‘ ملک خوشنودؔ کی مثنویاں ’یوسف زلیخا‘، ’جنت سنگار‘ اور رستمیؔ کی مثنوی ’خاور نامہ‘ ہے۔

۴۔ قطب شاہی عہد میں کئی اہم مثنویاں لکھی گئیں جن میں احمدؔ گجراتی کی ’یوسف زلیخا‘، ’لیلیٰ مجنوں‘، ملا وجہیؔ کی ’قطب مشتری‘ ابن نشاطیؔ کی ’پھول بن‘ غواصیؔ کی ’مینا ستونتی‘، ’سیف الملوک و بدیع الجمال‘، ’طوطی نامہ‘ جنیدیؔ کی ’ماہ پیکر‘ اور طبعیؔ کی ’بہرام وگل اندام‘ کا شمار اُردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔

۵۔ دکن میں مغلیہ عہد میں لکھی گئی مثنویوں میں عزلتؔ کی ’روضۃ الشہدا‘ بحریؔ کی ’من لگن‘ حسین ذوقیؔ کی ’وصال العاشقین‘ مجرمیؔ کی ’گلشنِ حسنِ دل‘ ولیؔ کی ’در مدحِ سورت‘ اور سراجؔ اورنگ آبادی کی ’بوستانِ خیال‘ وغیرہ قابلِ ذکر مثنویاں ہیں۔

11.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
مثنوی	:	دو دو والا، ایسی صنفِ سخن جس میں کوئی قصہ یا واقعہ بیان کیا گیا ہو اور جس کے شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے
اُستوار	:	قائم
محاکمہ	:	جائزہ
متداول	:	رائج
منبع	:	سرچشمہ، نکلنے کی جگہ
مستند	:	تصدیق کیا ہوا
رسہ کشی	:	کھینچا تانی، کش مکش
سرکوبی	:	سر کچلنا، سزا دینا
مہمات	:	جنگیں، لڑائیاں، مشکلات

معرفت	:	علمِ الٰہی، خدا شناسی
امتزاج	:	آمیزش، ہم آہنگی
محیط	:	احاطہ کرنے والا، گھیرے میں لینے والا
ماخذ	:	جس سے اخذ کیا جائے، بنیاد
شریعت	:	مذہبی قانون، قانونِ الٰہی
رزمیہ	:	وہ داستان جس میں جنگ کے حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہوں
انحطاط	:	تنزلی، پستی
خصلت	:	عادت، مزاج
پرماتما	:	اعلیٰ رُوح، وشنو، خدا

11.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں : پروفیسر گیان چند جین

۲۔ مثنوی نگاری : علی جواد زیدی

۳۔ تاریخِ ادبِ اُردو : ڈاکٹر جمیل جالبی

۴۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

۵۔ اُردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) : سید محمد عقیل رضوی

۶۔ جدید اُردو مثنوی: فن اور فکری ابعاد : ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر

اکائی 12 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

12.3.1 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا آغاز

12.3.2 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

12.3.3 شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگار

12.3.4 ماحصل

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

12.6 سوالوں کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے آغاز کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے بحث کریں گے۔
- شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں سے واقف ہوں گے۔
- شمالی ہند کی نمائندہ مثنویوں سے آگاہ ہوں گے۔
- شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔

12.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات سے واقف ہوئے۔ آپ

نے مثنوی کی اقسام کو بھی جانا اور دکن میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے بھی واقفیت حاصل کی۔ اب اس اکائی میں آپ شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے آغاز و ارتقا، وہاں کے نمائندہ مثنوی نگار اور نمائندہ مثنویوں سے واقف ہوں گے اور شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

12.3 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

12.3.1 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا آغاز

مولانا عبدالسلام ندوی کے مطابق شمالی ہند کا پہلا مثنوی نگار شاعر ہونے کا شرف میر تقی میرؔ کو حاصل ہے۔ انھوں نے میر تقی میرؔ کو اُردو مثنوی کا موجد کہا ہے لیکن جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میرؔ سے پہلے بھی اُردو مثنوی لکھی جانے لگی تھی۔ صوفیاے کرام نے جو مثنویاں لکھی ہیں، وہ بھی تاریخی اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔ متفقہ طور پر شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضلؔ پانی پتی کی 'بکٹ کہانی' ہے جو بارہ ماسہ کی صورت میں ہے۔ اس میں اپنے محبوب کے فراق اور ہجر کے دوران ایک عورت کے دل پر بیتی ہوئی کیفیات و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ میر جعفر زٹلیؔ نے باضابطہ مثنوی نہیں لکھی لیکن ان کی نظموں 'جوبن نامہ' اور 'اختلاف زماں' کو شمالی ہند کی مثنویوں کے ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے۔ زٹلیؔ کی مشہور مثنوی 'ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اورنگ زیب کے دکنی فتوحات کا ذکر ہے۔ زٹلیؔ کے کلام کی اہم خصوصیت طنزیہ اسلوب ہے۔ انھوں نے اس عہد کے سماج، سیاست، معیشت اور نااہل بادشاہوں پر ناقابلِ یقین اشعار قلم بند کیے جس کی وجہ سے انھیں جان بھی گنوانی پڑی۔ ولیؔ کے دیوان کی دہلی آمد سے جب شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی کا رواج ہوا تو صنفِ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ شاہ مبارک آبروؔ، حاتمؔ، فائزؔ اور میر تقی میرؔ جیسے شعرا نے صنفِ مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ حاتمؔ کے دیوان زادہ میں کل پانچ مثنویاں ہیں جن میں 'تمباکو' اور 'حقہ اور قہوے' قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ مبارک آبروؔ کی مثنوی 'آرائشِ معشوق' میں حسن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ فائزؔ کی مثنویوں کی کل تعداد سولہ ہے۔ ان کی اہم مثنویوں میں 'در وصف بھنگیڑن'، 'در وصف کا چھن'، 'تعریف جوگن'، 'تعریف ہولی'، 'بیان میلہ بہتہ' اور 'تعریف نہاں نگنبوذ' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب کہیں نہ کہیں ولیؔ کے طرز کی مثنویاں ہیں۔ ان شعرا کے بعد شمالی ہند میں اُردو مثنوی نگاری میں میرؔ کا نام آتا ہے۔

12.3.2 شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا

شمالی ہند میں اُردو مثنوی کی ترقی کا سہرا میر تقی میرؔ کے سر جاتا ہے۔ اس سے قبل بھی اس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے لیکن شمالی ہند میں اُردو مثنوی میر تقی میرؔ ہی کی مثنویوں کے ذریعے متعارف ہوئی۔ میرؔ نے چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں لکھیں جن کی تعداد ۳۸ تک پہنچتی ہے۔ ان کی بیش تر مثنویوں کا

موضوع عشق ہے۔انھوں نے حیوانات کے احوال،سماج اور فرد کی حالت زار، شکارنامہ، بیان مرغ بازاں، دنیا کی بے ثباتی اور جشنِ شادی کے موضوعات کو بھی مثنویوں میں جگہ دی ہےلیکن ان کی مثنوی نگاری کا محور عشق اور اس کی کیفیات کا بیان ہے۔ 'دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' ان کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔ان کی مثنویوں میں ذاتی غم کو زمانے کا غم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔میرؔ کی مثنویوں کی زبان سادہ، سہل اور عام فہم ہے مگر ان میں قصہ پن کی کمی کھٹکتی ہے۔اس کی وجہ قصہ کی پوری وضاحت وصراحت کی کمی، جزئیات نگاری پر کم توجہ اور کہانی کے پس منظر کی عدم تکمیل ہے۔ان کی مثنویوں میں 'دریائے عشق' مشہور مثنوی ہے جس میں انھوں نے اپنے گھر کی خستہ حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک عاشق محبوبہ کی جوتی کے لیے دریا میں چھلانگ لگاتا ہے جس کے سبب وہ ڈوب جاتا ہے۔کچھ دنوں کے بعد اس کی محبوبہ بھی ٹھیک اسی مقام پر ڈوب کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ یہ مثنوی فوقِ فطری عناصر سے پاک ہے اور اس میں بے جا مبالغہ آرائی سے گریز کیا گیا ہے۔اس طرح یہ مثنوی ایک سچے عشقیہ قصے کے طور پر سامنے آتی ہے۔میر تقی میرؔ کی مثنویوں میں پلاٹ ڈھیلے ہیں اور کردار نگاری زیادہ جان دار نہیں ہے تاہم میرؔ نے شاہ مبارک آبروؔ، حاتمؔ اور فائزؔ کے مقابلے میں اپنی مثنویوں میں مرقعوں اور جزئیات نگاری پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔انھوں نے قصوں کو بھی مثنویوں میں جگہ دینی شروع کی لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں میں فنی پختگی کا فقدان ہے۔ان کے قصوں میں سادگی زیادہ اور مافوق الفطرت عناصر کم ہیں لیکن ان کی مثنویاں رومانیت اور نسوانی نفسیات سے پُر نظر آتی ہیں البتہ ان کے یہاں مناظر اور مکالمے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ان سب باتوں سے قطع نظر، اُردو مثنوی نگاری میں میر تقی میرؔ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اس وقت مثنوی کی طرف متوجہ ہوئے جب ان کے سامنے مثنوی کا کوئی واضح اور عمدہ نمونہ موجود نہیں تھا۔

میر تقی میرؔ کے ہم عصروں میں مرزا محمد رفیع سوداؔ نے بھی مثنوی میں طبع آزمائی کی ہے، گو کہ ان کی شاعری کا اصل محور غزل اور قصیدہ ہے۔ انھوں نے غزل اور قصیدے کے علاوہ مثنویاں بھی تخلیق کی ہیں جن کی تعداد ۲۴ تک پہنچتی ہے۔انھوں نے اپنی مثنویوں میں ہجر، اخلاق، تہذیب، تنقید، آب وہوا، خط وکتابت اور مدح کے مضامین بیان کیے ہیں۔ چوں کہ سوداؔ بنیادی طور پر قصیدہ گو ہیں، اس لیے ان کی مثنویوں میں بھی اس کا رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے مثنوی کو ہجو یہ رنگ دے کر زوال آمادہ سماج کی تصویر کشی کی ہے۔ان کی مثنویوں میں طرز ادا کی خامیاں صاف نظر آتی ہیں۔ان کی صرف ایک مثنوی کو قابل اعتنا سمجھا گیا جس کا عنوان 'زرگر پسر وشیشہ گر' ہے۔ سوداؔ کے یہاں قصوں میں اختصار پایا جاتا ہے۔ان کی کردار نگاری میں بھی خامیاں نظر آتی ہیں۔ وہ جزئیات نگاری پر توجہ نہیں دیتے اور محاکات میں بے جا تخیل پروازی کا سہارا لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی مثنویاں فنی اعتبار سے ناقص نظر آتی ہیں۔ دہلی کی مثنویوں کا تاریخی محاکمہ کیا جائے تو اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دہلی کی تباہی سے قبل کی مثنویاں اور دوسری تباہی کے بعد کی مثنویاں۔ درج بالا مثنویاں تباہی کے قبل کی ہیں

جن میں صرف ایک مثنوی 'خواب وخیال' ہے جو اس عہد کی تمام مثنویوں میں ممتاز اور طویل ہے۔ یہ مثنوی خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر آثرؔ کی ہے۔ میر آثرؔ کو صاحب طرز مثنوی نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُردو مثنوی نگاری میں ان کا نام میر حسنؔ کے بعد لیا جاتا ہے۔ انھوں نے مثنوی 'خواب وخیال' کے ذریعے ہجر و وصال، راز و نیاز اور عشق و محبت کے مضامین کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ 'خواب و خیال' کے متعلق مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ ''شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت و شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی 'خواب و خیال' کا مقابلہ کرسکتی ہے''۔ اس مثنوی کی سادگی اور لطافت قابل تعریف ہے جب کہ مرقع نگاری میں میر آثرؔ نے اپنے تمام پیش روؤں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ مثنوی اہل نقد کی نظر میں زبان و بیان کے لحاظ سے 'سحر البیان' کے بعد بے مثال قرار دی گئی ہے۔ اس مثنوی کا پلاٹ کسی ایک قصے پر تیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ کئی قصوں کا مجموعہ ہے جس میں قاری کو پچاس سے زیادہ واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی ایک اہم خوبی اس کی سراپا نگاری ہے جو تقریباً سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان سادہ، سہل، صاف ستھری اور رواں دواں ہے۔ محاورات کے مناسب استعمال نے اس مثنوی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس مثنوی میں عشقیہ جذبات کو بھی خوب صورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تقلید میں کئی مثنویاں منظرِ عام پر آئیں مگر جو شہرت و مقبولیت اپنے زمانے میں اس مثنوی کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

زوالِ دہلی کے بعد شمالی ہند میں اُردو کو اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں فیض آباد اور لکھنؤ کے نام سے نئے دیار میسر آئے جہاں اُردو مثنوی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ یہ نئے دیار جلد ہی دبستان دہلی کے مقابل آگئے۔ یہاں کی مثنویوں میں وہ سبھی عناصر دکھائی دیتے ہیں جو فارسی مثنوی کے ہم پلہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ چوں کہ دبستان لکھنؤ کے شعرا کے نزدیک دہلی کی مثنویوں کے نمونے تھے اور بعض شعرا تو دہلی سے ہی یہاں آئے تھے، اس لیے لکھنؤ کی ابتدائی مثنویوں میں دہلی کا رنگ کافی حد تک نمایاں ہے۔ مثلاً قائمؔ چاند پوری اور میر سوزؔ کی مثنویوں میں یہ رنگ بہ طور خاص محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی رنگ میں میر دردؔ کے شاگرد ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ کی مثنوی ہے جو شہر بنارس کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ مرزا علی لطفؔ کی مثنوی 'نیرنگِ عشق' زبان و بیان کے اعتبار سے میرؔ کی مثنویوں کی طرح سادہ اور سلیس ہے۔ یہ مثنوی مصحفیؔ اور جرأتؔ کی مثنویوں کے مقابلے میں طویل ہے۔ اس میں ایک شاہ صاحب کی محبت کی داستان ہے جو عروسہ کے حسن پر اس قدر فریفتہ ہوجاتے ہیں کہ اس کا محافہ ان کے تکیہ کے قریب ٹھہرتا ہے اور جب وہ محافہ وہاں سے روانہ ہوتا ہے تو ان کی جان چلی جاتی ہے۔ جب یہ بات اس عروسہ کو پتہ چلتی ہے کہ اس کا عاشق دار فانی سے کوچ کر گیا ہے تو وہ ان کی قبر پر جا کر جان دے دیتی ہے۔ دبستان لکھنؤ کی شہرۂ آفاق مثنوی 'سحر البیان' ہے۔ میر حسنؔ کی اس مثنوی کو گذشتہ سبھی مثنویوں پر فوقیت حاصل ہے۔ میر حسنؔ کی یہ مثنوی اُردو مثنوی کی تاریخ میں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ 'سحر البیان' کے بعد بھی کئی ایسی

مثنویاں لکھی گئیں جو قاری کو اپنی جدت کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً غلام ہمدانی مصحفی کی مثنوی 'بحرالمحبت'، جس کا انداز میر کے 'دریائے عشق' کا سا ہے اور قصے میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصحفی نے میر کے موضوع کو ندرت کے ساتھ پیش کر کے اسے 'سحرالبیان' کا ہم پلہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش میں انھیں زیادہ کامیابی نہیں مل سکی کیوں کہ اس کی زبان میں سادگی کے مقابلے صناعی زیادہ ہے۔

دہلی اُجڑنے کے بعد جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو ایک مرتبہ پھر شعروشاعری کی محفل سجی اور ذوق، غالب اور مومن جیسے شعرا نے اُردو شاعری کو توانائی عطا کی اور اسے بلندی پر پہنچایا۔ غالب اور مومن نے غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی لکھیں۔ غالب کی ایک مثنوی 'درصفت انبہ' بہت معروف ہے۔ دوبارہ جب دہلی میں شعروشاعری کی محفل پر شباب آیا تو غزل گوئی کو جو فروغ حاصل ہوا، وہ اُردو مثنوی کو میسر نہیں آیا۔ اُردو مثنوی کا اصل فروغ لکھنؤ میں ہوا۔ دبستانِ لکھنو میں 'سحرالبیان' کے بعد جس مثنوی کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' ہے۔ یہ مثنوی دبستان لکھنؤ کی شہرۂ آفاق تصنیف قرار دی جاتی ہے۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی تقلید میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر وہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکیں۔ مثلاً آفتاب الدولہ قلق کی مثنوی 'طلسمِ الفت' کی حیثیت بھی مسلم ہے لیکن یہ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کی طرح ممتاز نہیں ہوسکی۔ پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے ساتھ ساتھ دبستان لکھنؤ میں جس مثنوی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی، وہ مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہرِ عشق' ہے۔ یہ بھی اُردو کی نمائندہ مثنویوں میں سے ایک ہے۔ منیر شکوہ آبادی کا تعلق بھی دبستان لکھنؤ سے ہے۔ انھوں نے بھی مثنوی لکھی ہے لیکن ان کی مثنوی 'معراج المضامین' مذہبی موضوعات پر لکھی گئی ہے جس سے اس کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ادب کا منظرنامہ بدلا تو مثنوی کے موضوعات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ واجد علی شاہ، امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، داغ دہلوی اور شوق قدوائی اس عہد کے نمائندہ مثنوی نگار ہیں۔ ان شعرا نے مثنوی کے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اثرات قبول کیے۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب لاہور کے تحت جدید مثنوی کی بنیاد ڈالی۔ اب مثنوی عشق و عاشقی کی داستان سے نکل کر حقیقت کے قریب ہوتی نظر آئی اور مافوق الفطرت عناصر سے پاک ہو کر زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنے لگی۔ قدیم مثنوی میں عشق محور و مرکز تھا لیکن جدید عہد میں اس کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ گئی۔ اب مثنویوں میں سماج، قوم، سیاست اور معیشت کے موضوعات برتے جانے لگے۔ اس عہد میں داغ، امیر اور محسن کی مثنویاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن پنجاب کے زیرِ اثر اُردو شاعری میں نئی فکر کو اہمیت دی گئی اور فطری اور حقیقی شاعری پر زور دیا جانے لگا۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد، سرسید اور حالی پیش پیش رہے۔ سرسید کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں حالی کی 'برکھا رُت' اور 'چُپ کی داد' جیسی مثنویاں منظر عام پر آئیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی کئی مثنویاں لکھیں جس میں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے افکار و احساسات کے اظہار کے لیے مثنوی کو وسیلہ بنایا۔ فارسی میں انھوں نے کئی مثنویاں لکھی ہیں

جن میں 'اسرارِ خودی' بہت مشہور ہے۔ اُردو میں ان کی مثنوی 'مسافر' قابلِ ذکر ہے۔ ان کے 'ساقی نامہ' میں بھی مثنوی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے علامہ اقبال نے جو پیغام دیا ہے، اس کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کی 'شاہنامہ اسلام' جدید عہد کی سب سے طویل مثنوی ہے جس کے اشعار زبان زد عام ہیں۔ اس کا دیباچہ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اسلام کی منظوم تاریخ ہے۔ انھوں نے اسے اسلامی اخلاق کی تعلیم کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس کے الفاظ سادہ اور مترنم ہیں۔ بہ طور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ستاروں کی شہادت پر ظہور مہر تاباں ہے
سحر کا رنگ کیا ہے، سرخیٔ خونِ شہیداں ہے

زمیں اہل وفا کے خون سے نم ناک ہوتی ہے
تو آزادی یہاں ہل جوتتی ہے بیج بوتی ہے

احد کے داغ دھبے باغ باں نے پاک فرمائے
تو پھر ستر شہید اس میں سپرد خاک فرمائے

شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے جائزے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہاں اُردو مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا خصوصاً لکھنؤ میں اُردو مثنوی اپنے عروج کو پہنچی۔ 'سحر البیان'، 'گلزارِ نسیم' اور 'زہرِ عشق' جیسی مثنویاں دبستان لکھنؤ ہی کی یادگار ہیں۔

12.3.3 شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگار

شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگار میر حسنؔ، پنڈت دیا شنکر نسیمؔ اور مرزا شوقؔ لکھنوی ہیں۔ میر حسنؔ نے کل بارہ مثنویاں لکھیں جن میں مثنوی 'سحر البیان' اُردو کی لازوال اور یادگار مثنوی ہے۔ اُردو شاعری میں کسی مثنوی کو وہ مقبولیت نہیں ملی جو مثنوی 'سحر البیان' کو حاصل ہوئی۔ یہ باضابطہ پہلی مثنوی ہے جس میں خالص ادبیت کے نمونے ملتے ہیں۔ یہ مثنوی کل ۲۱۷۹ اشعار پر مشتمل ہے اور اپنے مکالمے، کردار، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور زبان و بیان کے لحاظ سے اُردو کی نمائندہ مثنوی ہے۔ یہ مثنوی 'قصہ بے نظیر اور بدر منیر' کے نام سے بھی معروف ہے کیوں کہ اس میں ان دونوں کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں لکھنوی معاشرت کی دل چسپ مصوری کی گئی ہے۔ اس لیے یہ مثنوی لکھنوی تہذیب کی نمائندہ مثنوی قرار دی گئی ہے۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے کردار اور مناظر میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ اس میں حکمراں طبقہ کی شان و شوکت، محل کی رونق، اولاد نہ ہونے کی شکایت، ناامیدی کا رجحان، نجومیوں کی شعبدہ بازی، بچے کی ولادت کے رسوم، ناچنے گانے والیوں کی ادائیں، عمارت کی بلندی، خوشی کے مواقع، غرض لکھنوی معاشرت سے متعلق تمام واقعات و حالات

اپنی دل کش صورتوں میں موجود ہیں۔اس طرح یہ مثنوی اپنے عہد کے سماج کا ترجمان بن جاتی ہے۔اس مثنوی کے تعلق سے عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں:

> ''بے نظیر اور بدر منیر کی داستانِ عشق اپنے فوق الفطرت عناصر اور نصب العینی ماحول کے باوجود حیات انسانی کی اصلی اور بنیادی صداقتوں اور فطرت انسانی کی غیر متغیر حقیقتوں سے معمور ہے۔ وہ ایک مسلسل قصہ ہے اور عمدہ فن کاری کا نمونہ۔''
>
> (عبدالقادر سروری، اُردو مثنوی کا ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص:۱۲۰)

میر حسؔن نے نجم النساء کے نسوانی کردار میں جو فطری عناصر اور جذبات نگاری کے نمونے پیش کیے ہیں، وہ مشاہدات پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس مثنوی میں مناظر کو دل کش انداز میں نظم کیا ہے جس سے مسحور کن کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی اپنی مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی ممتاز ہے کیوں کہ اس کے مکالمے دہلی کے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ بسیط اور قدیم شاعروں کے مقابلے میں روزمرہ کے الفاظ پر مبنی ہیں مثلاً:

ذرا منصفو! داد کی ہے یہ جا — کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا
زبس عمر کی اس کہانی میں صرف — تب ایسے یہ موتی سے نکلے ہیں حرف
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں

اُردو مثنوی کی تاریخ میں میر حسؔن کی مثنوی 'سحرالبیان' کو شاہ کار حیثیت حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو مثنوی کا نام آتے ہی میر حسؔن اور ان کی مثنوی 'سحرالبیان' کا نام ذہن میں آتا ہے۔ 'دروصف قصر جواہر'، 'رموز العارفین' اور 'گلزار ارم' بھی میر حسؔن کی قابلِ ذکر مثنویاں ہیں لیکن انھیں 'سحرالبیان' جیسی شہرت نہ مل سکی۔ شمالی ہند کے مثنوی نگاروں میں پنڈت دیا شنکر نسؔیم کا نام بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے 'گلزارِ نسیم' کے نام سے لا ثانی مثنوی تخلیق کی۔ یہ مثنوی اپنے اختصار، حسن کاری اور صنعت گری میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا قصہ طبع زاد نہیں ہے۔ یہ عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ نہال چند لاہوری نے فورٹ ولیم کالج میں کیا تھا اور نسؔیم نے اسے 'گلزار نسیم' کی شکل میں پیش کر دیا۔ اس کا ایجاز و اختصار اس کا فنی معجزہ ہے جس میں نسؔیم نے سحر کاری دکھائی ہے۔ اس کا قصہ مختصراً یوں ہے کہ سلطان زین الملوک پورب کے بادشاہ ہیں۔ ان کے چار لڑکے ہیں۔ پانچویں لڑکے کی پیدائش سے قبل نجومی بتاتا ہے کہ اگر اس کی بارہ سال کی عمر تک بادشاہ کی نظر اس پر پڑی تو بادشاہ کی بینائی ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا اسے بادشاہ کی نظروں سے دُور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ایک دن اچانک بادشاہ کی نظر اس پر پڑتی ہے اور وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ ایک حکیم بتاتا ہے کہ باغِ ارم میں

بکاؤلی نام کا ایک پھول ہے جس کے استعمال سے بینائی لوٹ سکتی ہے۔ چنانچہ چاروں شہزادے اس کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ اس تلاشِ گل میں پانچواں شہزادہ بھی ساتھ ہو جاتا ہے جو ایک دیو کے ساتھ مل کر اور دیونی کی مدد سے بکاؤلی کا پھول حاصل کرتا ہے۔ اس طرح بادشاہ کی بینائی واپس آجاتی ہے۔ اس کا پلاٹ بہت پے چیدہ ہے۔ یہ محض پھول کو حاصل کرنے کا واقعہ نہیں ہے بلکہ قصہ در قصہ جڑتا ہوا اس کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے اور تاج الملوک اور بکاؤلی کی شادی کے ساتھ مثنوی انجام کو پہنچتی ہے۔ اس میں لکھنوی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی تھی، اس عہد میں لکھنؤ کا سماج عیش ونشاط میں ڈوبا ہوا تھا اور اس معاشرے میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس پر عورت کا حکم نہ چلتا ہو۔ اس مثنوی میں عورت کے کردار کو مرد کرداروں سے زیادہ توانا اور فعال بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ دایہ، دلبر بیسوا، حمالہ دیونی، محمودہ، بکاولی، سمن پری، جمیلہ پری، روح افزا پری، رانی چتراوت، دہقان زادی اور اسی طرح کے نسوانی کردار پوری مثنوی پر حاوی نظر آتے ہیں جب کہ مردانہ کردار کی شکل میں تاج الملوک کے چاروں بھائی نکمے نظر آتے ہیں۔ مثنوی 'گلزارِ نسیم' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پردہ جو حجاب سا اٹھایا — آرام میں اس پری کو پایا
بند اس کی وہ چشم نرگسی تھی — چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی
سمٹی تھی جو محرم اس قمر کی — برجوں پہ سے چاندنی تھی سر کی
لپٹے تھے جو بال کروٹوں میں — مل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

یہ اشعار لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرے کے عکاس ہیں۔ اس طرح کے اشعار مثنوی میں جا بہ جا موجود ہیں۔ یہ مثنوی اپنے منفرد لب و لہجے، اختصار اور پلاٹ کے گٹھے ہوئے ہونے کی وجہ سے فنی اعتبار سے شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دبستان لکھنؤ کی نمائندہ مثنوی ہے جس میں لکھنوی معاشرت کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔ صنائع وبدائع کے استعمال، برمحل مکالمے، جذبات نگاری اور منظر نگاری نے اس مثنوی کو دل کش بنا دیا ہے۔ اس مثنوی کو لکھنوی معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع بھی کہا جاتا ہے۔ شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں میں مرزا شوقؔ لکھنوی کا نام بھی بے حد اہم ہے۔ انھوں نے تین یادگار مثنویاں تخلیق کیں جو 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' کے عنوان سے منظر عام پر آئیں۔ ان کی مثنویوں میں 'زہرِ عشق' کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک حزنیہ مثنوی ہے۔ اس میں محبت کی الم ناکی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کی زبان وبیان، مکالمے اور ماحول کی حزنیہ پیش کش قاری کو مسحور کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس میں محاورات کی برجستگی اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ اس میں بیگمات لکھنؤ کی زبان، ضرب المثل اور محاورات کو اتنی خوبی سے برتا گیا ہے کہ جاذبیت اور دل کشی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ مثنوی بھی لکھنوی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ جذبات نگاری، برمحل مکالمے، منظر نگاری اور اسلوب کی سادگی اس مثنوی کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ مثنوی بھی اُردو کی ایک نمائندہ مثنوی ہے۔

12.3.4 ماحصل

شمالی ہند میں اُردو مثنوی کا آغاز افضلؔ پانی پتی کی 'بکٹ کہانی' سے ہوا۔ میر جعفر زٹلیؔ نے باضابطہ مثنوی نہیں لکھی لیکن ان کی نظمیں 'جوبن نامہ' اور 'اختلاف زماں' میں اُردو مثنوی کے ابتدائی نقوش موجود ہیں۔ صوفیاے کرام کی مثنویاں تاریخی اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔ ولیؔ کے دیوان کی دہلی آمد سے جب شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی کا رواج ہوا تو صنفِ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ شاہ مبارک آبروؔ، حاتمؔ، فائزؔ، میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ جیسے شعرا نے صنفِ مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ اس عہد کی بلکہ دبستان دہلی کی نمائندہ مثنوی 'خواب وخیال' ہے جسے خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ نے لکھا ہے۔ اس مثنوی کی سادگی اور لطافت قابل تعریف ہے جب کہ مرقع نگاری میں میر اثرؔ نے اپنے تمام پیش رووں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ اُردو شاعری کا مرکز قرار پایا۔ قائمؔ چاند پوری، میر سوزؔ، ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ، مرزا علی لطفؔ، مصحفیؔ اور جرأتؔ نے لکھنؤ میں مثنویاں تخلیق کیں اور اپنی صلاحیت کے مطابق اس میں کمال کا مظاہرہ کیا۔ دہلی کی تباہی کے بعد جب حالات سازگار ہوئے تو دہلی میں دوبارہ شعروشاعری کی محفل جمی جہاں غالبؔ اور مومنؔ نے غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی لکھیں لیکن اُردو مثنوی کو اصل عروج وارتقا لکھنؤ میں حاصل ہوا۔ 'سحر البیان'، 'گلزارِ نسیم' اور 'زہرِ عشق' جیسی مثنویاں دبستانِ لکھنؤ ہی کی یادگار ہیں۔ میر حسنؔ، پنڈت دیا شنکر نسیمؔ اور مرزا شوقؔ لکھنوی نے اپنی فنی مہارت سے اُردو مثنوی کو انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ادب کا منظر نامہ بدلا تو مثنوی کے موضوعات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ واجد علی شاہ، امیرؔ مینائی، امیر اللہ تسلیمؔ، داغؔ دہلوی اور شوقؔ قدوائی نے مثنوی کے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اثرات قبول کیے۔ محمد حسین آزادؔ نے انجمن پنجاب لاہور کے تحت جدید مثنوی کی بنیاد ڈالی۔ اب مثنوی مافوق الفطرت عناصر سے پاک ہوکر زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنے لگی۔ قدیم مثنویوں میں حسن وعشق اور رزم و بزم کے موضوعات حاوی تھے لیکن اب جدید مثنویوں میں سماج، قوم، سیاست اور معیشت کے موضوعات برتے جانے لگے۔ اس عہد میں داغؔ، امیرؔ اور محسنؔ کی مثنویاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن پنجاب کے زیرِ اثر اور سرسید کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں حالیؔ کی 'برکھارُت' اور 'چُپ کی داد' جیسی مثنویاں منظرِ عام پر آئیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی کئی مثنویاں لکھیں جس میں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے افکار واحساسات کے اظہار کے لیے مثنوی کو وسیلہ بنایا۔ ان کی مثنویوں میں 'مسافر' قابلِ ذکر ہے۔ ان کے 'ساقی نامہ' میں بھی مثنوی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ حفیظؔ جالندھری کی 'شاہنامہ اسلام' جدید عہد کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ اس طرح شمالی ہند میں اُردو مثنوی کو خوب فروغ حاصل ہوا اور اس کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے آغاز کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے ارتقا سے بحث کی۔
- شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں سے واقفیت حاصل کی۔
- شمالی ہند کی نمائندہ مثنویوں سے آگہی حاصل کی۔
- شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھا۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

١۔ شمالی ہند کی پہلی مثنوی اور اس کے خالق کا نام بتائیے۔

٢۔ شمالی ہند کی اہم مثنویوں کے نام لکھیے۔

٣۔ شمالی ہند کی مثنویوں کے موضوعات سے بحث کیجیے۔

٤۔ میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری پر اظہارِ خیال کیجیے۔

٥۔ مثنوی 'خواب وخیال' کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

12.6 سوالوں کے جوابات

١۔ شمالی ہند کی پہلی مثنوی 'بکٹ کہانی' ہے اور اس کے خالق افضلؔ پانی پتی ہیں۔

٢۔ شمالی ہند کی اہم مثنویوں میں 'خواب وخیال'، 'سحر البیان'، 'گلزارِ نسیم' اور 'زہرِ عشق' قابلِ ذکر ہیں۔

٣۔ شمالی ہند کی قدیم مثنویوں کے موضوعات میں حسن و عشق کو کلیدی جگہ حاصل تھی، ساتھ ہی رزم و بزم کے موضوعات بھی برتے جاتے تھے۔ جب کہ جدید مثنویوں میں سماجی، سیاسی، قومی، ملکی، انفرادی اور اجتماعی، غرض ہر طرح کے مسائل، انسانی قدروں اور زندگی کے نشیب و فراز کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ مظاہرِ فطرت، موسم، میلے اور تیوہاروں وغیرہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

٤۔ میر تقی میرؔ نے چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں لکھیں جن کی تعداد ٣٨ تک پہنچتی ہے۔ ان کی بیش تر مثنویوں کا موضوع عشق ہے۔ انھوں نے حیوانات کے احوال، سماج اور فرد کی حالت زار، شکار نامہ، بیان مرغ

بازاں، دنیا کی بے ثباتی، اور جشن شادی کے موضوعات کو بھی مثنویوں میں جگہ دی ہے لیکن ان کی مثنوی نگاری کا محور عشق اور اس کی کیفیات کا بیان ہے۔ 'دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' ان کی نمائندہ مثنویاں ہیں۔ ان کی مثنویوں میں ذاتی غم کو زمانے کا غم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ میرؔ کی مثنویوں کی زبان سادہ، سہل اور عام فہم ہے۔ ان کی مثنویوں میں قصہ پن کی کمی کھٹکتی ہے۔ اس کی وجہ قصہ کی پوری وضاحت و صراحت کی کمی، جزئیات نگاری پر کم توجہ اور کہانی کے پس منظر کی عدم تکمیل ہے۔ میر تقی میرؔ کی مثنویوں میں پلاٹ ڈھیلے ہیں اور کردار نگاری زیادہ جان دار نہیں ہے تاہم میرؔ نے شاہ مبارک آبروؔ، حاتمؔ اور فائزؔ کے مقابلے میں اپنی مثنویوں میں مرقعوں اور جزئیات نگاری پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔ انھوں نے قصوں کو بھی مثنویوں میں جگہ دینی شروع کی لیکن اس کے باوجود ان کی مثنویوں میں فنی پختگی کا فقدان ہے۔ ان کے قصوں میں سادگی زیادہ اور مافوق الفطرت عناصر کم ہیں لیکن ان کی مثنویاں رومانیت اور نسوانی نفسیات سے پُر نظر آتی ہیں البتہ ان کے یہاں مناظر اور مکالمے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

۵۔ مثنوی 'خواب و خیال' میں ہجر و وصال، راز و نیاز اور عشق و محبت کے مضامین کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'خواب و خیال' کے متعلق مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ ''شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت و شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی 'خواب و خیال' کا مقابلہ کرسکتی ہے''۔ اس مثنوی کی سادگی اور لطافت قابل تعریف ہے جب کہ مرقع نگاری میں میر اثرؔ نے اپنے تمام پیش رووں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ مثنوی اہل نقد کی نظر میں زبان و بیان کے لحاظ سے 'سحر البیان' کے بعد بے مثال قرار دی گئی ہے۔ اس مثنوی کا پلاٹ کسی ایک قصے پر تیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ کئی قصوں کا مجموعہ ہے جس میں قاری کو پچاس سے زیادہ واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس مثنوی کی ایک اہم خوبی اس کی سراپا نگاری ہے جو تقریباً سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان سادہ، سہل، صاف ستھری اور رواں دواں ہے۔ محاورات کے مناسب استعمال نے اس مثنوی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس مثنوی میں عشقیہ جذبات کو بھی خوب صورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

12.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
خستہ حالی	:	مفلسی، ناداری، تنگ دستی
محاکات	:	کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا
محاکمہ	:	انصاف طلبی، فیصلہ کرنا

ثمر	:	پھل
فریفتہ	:	عاشق، دل دادہ
عروسہ	:	دلہن
مہرتاباں	:	روشن سورج
شعبدہ بازی	:	نظر بندی، جادوگری، عیاری، چالاکی
نرگسی	:	نرگس سے مشابہ، نرگس جیسا
برجوں	:	برج کی جمع، ستارے کا مقام
لٹوں	:	لٹ کی جمع، بالوں کی لڑی، جٹا
حزنیہ	:	دردناک، المیہ
پیش رووں	:	آگے گزرنے والے، آگے آگے چلنے والے
تربت	:	قبر، مزار
لوح	:	قبر کے سرہانے کا پتھر یا سل، لکھنے کی تختی
سہاگن	:	وہ عورت جس کا خاوند زندہ ہو

12.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اُردو مثنوی کا ارتقا : پروفیسر عبدالقادر سروری

۲۔ اُردو کی تین مثنویاں : پروفیسر خان رشید

۳۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں : پروفیسر گیان چند جین

۴۔ تاریخِ ادبِ اُردو : پروفیسر وہاب اشرفی

۵۔ تاریخِ ادبِ اُردو : ڈاکٹر رام بابو سکسینہ